سوانح حیات

جمال الدین افغانی

میرزا ادیب

تحفہ از
جناب علامہ مضطر عباسی

جمال الدین افغانی

میرزا ادیب

پبلشرز یونائیٹڈ، چوک انارکلی - لاہور

۱۹۴۷

باراوّل   تعداد ۲۰۰۰   قیمت عمہ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام محمد سلام پرنٹر پبلشر چھپ کر یونائیٹڈ لاہور سے شائع ہوا۔

Mu. Abbasi.

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

(علامہ اقبال مرحوم)

پیرایۂ آغاز

یہ کتاب آٹھویں جماعت سے لیکر دسویں جماعت کی قابلیت کے طلبا کے لئے ہے۔

میں نے جس نقطۂ نظر سے مشرق کی اس جلیل القدر ہستی کے واقعاتِ حیات کو سپردِ قلم کیا ہے وہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے کتاب اپنی وضاحت آپ کریگی۔

یہاں ایک دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا غالباً ناموزوں نہ ہوگا!

میں نے "سوانحی طرز" کی بہت سی کتابوں کا غور کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتابیں خاص طور پر بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ مگر ان میں باوجود کوشش کے میں اس جذبے کی شدت اور گہرائی کا احساس نہیں کر سکا جو اس قسم کی کتابوں میں جاری و ساری ہونا چاہیئے!

دوسرے لفظوں میں یہ کتابیں بچوں کو ذہنی طور پر متاثر نہیں کرتیں۔ چنانچہ بڑی سے بڑی ہستیاں ان کے سامنے آتی ہیں۔ مطالعے کے دوران میں ان کے قریب رہتی ہیں۔ مگر جب کتاب کا آخری ورق الٹا جاتا ہے تو یہ تاریخی افراد بچوں کے

ذہنوں پر ان مٹ نقوش چھوڑے بغیر وقت کے دھندلکوں میں غائب ہو ہو کر ہمیشہ کے لئے دلوں سے دور ہو جاتی ہیں!۔

میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ صرف ایک ہے۔

سوانح نگار اور "فردِ سوانح" کے درمیان اجنبیّت اور غیریت کا شدید احساس سوانح نگار جس کے بارے میں لکھتا ہے اس کے ماحول میں داخل نہیں ہوتا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کے دماغ کے گوشوں کو نہیں ٹٹولتا۔ مختصر یہ کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت دور رہتے ہیں۔ وقت اور ماحول ان کے درمیان پتھر کی دیوار بن کر کھڑا رہتا ہے!

مجھے جمال الدین افغانی سے گہری محبّت اور عقیدت ہے۔ مگر جب میں نے قلم اٹھایا تو مجھے صرف ان سے محبّت تھی، اس محبت نے "بے تکلفی" کا کچھ احساس ضرور پیدا کیا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں میں نے ذہنی طور پر جمال الدین افغانی کے بہت قریب رہ کر یہ کتاب لکھی ہے!

کتاب لکھتے وقت ویسے تو تین چار کتابیں میرے پیشِ نظر تھیں، لیکن میں نے قاضی عبدالغفار خاں کی معرکہ آرا تالیف "آثار جمال الدین افغانی" سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا ہے اور میں احسان مندانہ مسرت کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرتا ہوں!

میرا ارادہ ہے کہ تمام نمایاں زعمائے مشرق کے متعلق کتابیں لکھوں ــــ یہ سلسلہ بچوں کی ذہنی نشو و نما کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۰ اگست ۱۹۴۶ء — میرزا ادیب

جمال الدین افغانیؒ

خزاں کے موسم میں آپ باغوں میں سے اکثر گذرے ہوں گے۔ ہر جگہ ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔ نہ درختوں پر سبز سبز پتے دکھائی دیتے ہیں، نہ پودوں کی شاخوں پر زنگارنگ کے پھول نظر آتے ہیں۔ اور نہ ہی کہیں شادابی کی جھلک کا احساس ہوتا ہے۔ جب تک بہار آئے باغوں کا یہی حال رہتا ہے۔ بہار آتی ہے تو حالت سدھرنے لگتی ہے خزاں میں جو حالت باغوں کی ہوتی ہے وہی حالت سیّد جمال الدین افغانی کے دنیا میں آنے سے پہلے اسلامی ملکوں کی تھی۔ خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ نظم و نسق تباہ ہو چکا تھا۔ اور نااتفاقی کا دور دورہ تھا۔ انتشار کے اس عالم میں کسی اسلامی حکومت کا مضبوط ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنا نہ صرف مشکل بلکہ قطعاً ناممکن تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اس وقت دشمن حکومتیں من مانی کارروائی کر رہی تھیں اور اسلامی تاجداروں کی کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ اور کیوں نہ اُٹھائیں۔ اس سے بہتر موقعہ انہیں اور کہاں ملسکتا تھا۔ سیّد جمال الدین افغانی کے وطن افغانستان کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی، اس زمانے میں افغانستان کی حکومت امیر دوست محمد خاں کے ہاتھ میں

تھی۔ دوست محمد خاں کو جمال الدین پر گہرا اعتماد تھا۔ مگر اس کی سلطنت پر برطانوی سایہ پھیلتا جا رہا تھا۔ یہ تو تھا افغانستان کا حال، اب ہندستان کی طرف رُخ کیجیے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی جو تجارت کا مقصد لے کر ہندستان آئی تھی، اپنی مسلسل کوششوں کے بعد اس وسیع ملک پر قبضہ کر رہی تھی اور اس تیزی کے ساتھ قبضہ کر رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا۔ ہندستان برطانیہ کا پوری طرح غلام ہو چکا ہے۔ برطانیہ کے مقابلے میں دوسری بڑی طاقت روس تھی جس نے وسط ایشیا میں خیوا اور بخارا پر قبضہ کر رکھا تھا۔ مصر میں نہ تو ترکی کا اقتدار قائم تھا اور نہ خدیو کی حکومت، یہاں بھی برطانوی طاقت بڑھتی جا رہی تھی۔ ایران کے حصے بکھرے ہو رہے تھے۔ اور یورپ کی مختلف حکومتیں ان حصوں پر قابض ہوتی جا رہی تھیں۔ ترکی کی حالت قابلِ رحم تھی۔ چنانچہ یورپ کی حکومتیں اسے "مریضِ ناتواں" کہتی تھیں۔ دنیا کی یہی بڑی بڑی اسلامی سلطنتیں تھیں اور ان میں سے ہر ایک زندگی اور موت کے درمیان آخری سانس لے رہی تھی۔ ایک بار اور خزاں کے موسم میں اجڑے ہوئے باغ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے لائیے۔ کیا اجڑے ہوئے باغ اور اسلامی حکومتوں کی حالت، ایک جیسی نہیں تھی؟

یہ تھے وہ حالات جن کا جمال الدین افغانی کو مقابلہ کرنا تھا۔ ظاہر ہے اس سے بدتر کیا حالت ہو سکتی ہے؟ "اپنے" خانہ جنگی میں اپنی رہی سہی طاقت

ضائع کر رہے تھے۔ اور "غیر" ہر طریقے سے ایک ایک سلطنت کا خاتمہ کر رہے تھے۔ انہی حالات سے اندازہ لگایئے کہ جمال الدین کی شخصیت کتنی بڑی شخصیت تھی جس نے نہ صرف یہ کہ سخت خطرناک حالات کا مقابلہ کیا۔ بلکہ اسلامی حکومتوں کو بھی اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں۔ اس فقرے سے یہ مطلب نہ سمجھئے کہ اس زمانے میں سید جمال الدین کے علاوہ اور کوئی شخص کھوئے ہوئے اسلامی اقتدار کو واپس لانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا — ! ایک نہیں کئی اللہ کے بندے تھے۔ مثلاً ترکی میں مدحت پاشا اور مصطفےٰ کمال، ایران میں سید عبداللہ، سید محمد طباطبائی، ٹیونس میں خیرالدین پاشا، الجیریا میں امیر عبدالقادر، طرابلس میں امام محمد بن سنوسی۔ ان کے علاوہ اور لوگ بھی تھے جو سر دھڑ کی بازی لگا کر دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ مگر ان لوگوں اور سید جمال الدین افغانی میں ایک خاص فرق تھا۔ ان لوگوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے ملک کو آزاد کرانے کی جان توڑ کوشش میں تھا۔ لیکن ان کے مقابلے میں سید جمال الدین افغانی ایک ایسا شخص تھا جس کے پیش نظر سارے اسلامی ملکوں کی آزادی کا سوال تھا وہ سب غلام ملکوں کو آزادی کے لئے لڑنا چاہتا تھا۔ اور ہر ملک اُسے اپنا حقیقی راہنما سمجھتا تھا۔ وہ اپنے وطن افغانستان کے لئے اتنا ہی ضروری تھا جتنا ترکی یا مصر کے لئے۔ سید جمال الدین افغانی کا نام اپنے عہد کی اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا نام تھا — اتنا بڑا نام کہ اس زمانے کے بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی اس

سے ڈرتا تھا۔ آپ تاریخ میں جن بڑے بڑے آدمیوں کا ذکر پڑھتے ہیں۔ ان سب کے پیش نظر ایک خاص مقصد تھا۔ اور اسی مقصد کو پورا کرنے میں انہوں نے اپنی جانیں قربان کردیں۔ سید جمال الدین بھی ایک خاص مقصد لے کر دنیا میں آئے تھے اور جب تک وہ زندہ رہے اپنا آرام۔ اپنا چین بھول کر اسی مقصد کی خاطر لڑتے رہے وہ مقصد کیا تھا، وہ کس طرح اس مقصد کے لیے جنگ کرتے رہے اس راہ میں انہیں کن کن دشواریوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کس طرح اُنہوں نے خوفناک سے خوفناک مصیبت کا مقابلہ کیا۔ اور اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل کی، یہ سب کچھ آپ کو آئندہ صفحوں میں ملے گا۔

خاندانی حالات!

اوپر کی سطروں کے مطالعے سے آپ پر یہ بات روشن ہوگئی ہوگی کہ سیّد جمال الدین افغانی کی دنیا میں آنے کے وقت اسلامی ملکوں کا کیا حال تھا۔ اور اس عظیم الشان شخصیّت کے سامنے کیسے کیسے پہاڑ راستہ روکے کھڑے تھے۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم افغانی کی جدوجہد کا حال لکھیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندانی حالات کے بارے میں آپ کو کچھ بتادیں، اُن کا پورا نام تھا سید جمال الدین الحسینی الافغانی آپ شعبان ۱۲۵۴ھ بہ مطابق ۱۸۳۹ء میں افغان کے ایک غیر معروف علاقے

کونڑ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کی کئی مشہور ہستیوں کا نام آج بھی عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ سرحد کے نامی گرامی بزرگ سیّد علی ترمذی آپ ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سید علی ترمذی دسویں صدی کے شروع میں افغانستان آ گئے تھے۔ اور یہیں اُنہوں نے اپنے علم و فضل سے لوگوں کو فیضیاب کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ جو اس وقت تک جاری رہا۔ جب تک وہ اس دنیا میں موجود رہے۔ چونکہ سیّد ترمذی نے زندگی کا بہت بڑا حصّہ افغانستان میں گذارا تھا۔ اس لئے اُن کی اولاد افغانستان اور سرحد میں پھیل گئی۔ آج بھی سادات کے جو خاندان افغانستان اور اس کے نواح میں نظر آتے ہیں اُن میں سے زیادہ تر انہی بزرگ سید علی ترمذی کی اولاد میں سے ہیں۔

سید جمال الدین افغانی کے والد سیّد صفدر انہی سادات خاندان میں سے تھے۔ اور اپنی خوبیوں کی وجہ سے ملک میں کافی اثر رسوخ رکھتے تھے۔ ان کی علمیّت کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے آدمی علمی باتوں میں اُن سے رائے لیا کرتے تھے۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ اٹھارہ سال کی عمر تک سید جمال الدین اپنے والد کے ساتھ کابل میں رہے جہاں وہ اس زمانے کے نامور عالموں سے علم حاصل کرتے رہے۔ ان عالموں میں سید فقیر بادشاہ کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے۔ اس وقت علم و فضیلت میں سید فقیر بادشاہ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اپنے والد سے بھی انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا چنانچہ کہا جاتا ہے ابھی ان کی عمر

دس سال کے لگ بھگ تھی کہ وہ نحو، تاریخ، فلسفہ، ریاضی، طب اور ہندسہ میں ماہر ہو چکے تھے۔ اندازہ لگایئے یہ شخص کس قدر ذہین تھا کہ جو علم آج کل تیس سال کی عمر میں بھی نہیں سیکھے جا سکتے وہ اُس نے اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں ہی میں حاصل کر لئے تھے یہاں ایک اور بات بھی غور کرنے کے قابل ہے۔ انگریزی کا ایک مشہور نظم میں کہا گیا ہے۔ کہ جن لوگوں کو دنیا میں بڑے آدمی بننا ہوتا ہے وہ اس وقت کام میں مصروف رہتے ہیں۔ جس وقت عام آدمی سوتے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ طالب علم جو چاہتے ہیں کہ دنیا میں ترقّی کریں اور اپنی قوم اور ملک کی خدمت کریں۔ وہ اپنا قیمتی وقت بیکار باتوں میں ضائع نہیں کرتے بلکہ محنت کر کے اپنے ساتھیوں سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ سید جمال الدین افغانی کے دل میں بچپن ہی سے یہ آرزو تھی کہ وہ اسلام کی خدمت کریں۔ چنانچہ کھیل کود میں وقت گذارنے کی بجائے وہ اپنے اندر زیادہ سے زیادہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور اس مقصد میں کس قدر کامیاب ہوئے اس کا اندازہ آپ خود ساری کتاب پڑھ کر لگا سکیں گے!

آپ شروع ہی سے جمال الدین کے ساتھ افغانی کا لفظ پڑھ رہے ہیں ظاہر ہے افغانی سے مراد ہے۔ افغانستان سے ان کا وطنی تعلق ہے۔ یعنی وہ افغانستان میں پیدا ہوئے اور افغانستان ان کا وطن ہے۔ بعض ایرانی عالموں نے دعویٰ کیا ہے کہ سید جمال الدین افغانی نہیں ایرانی تھے۔ اس بات کو صحیح

ثابت کرنے کے لئے ایرانی بزرگوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں. اور انہیں ایرانی منوانے کے لئے حتی الامکان کوشش کی ہے. شروع شروع میں لوگ انہیں افغانی کی بجائے ایرانی ماننے لگے تھے مگر اب تحقیق نے یہ بات سچ ثابت کر دی ہے کہ جمال الدین ایرانی نہیں بلکہ افغانی تھے. ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایران میں رہے اور یہاں جو کارنامے سرانجام دیئے انہیں دُنیا کبھی بھول نہیں سکتی!

ہم سمجھتے ہیں سید جمال الدین کو ایرانی یا افغانی ثابت کرنے کا سوال بے معنی ہے کیونکہ سیّد صاحب ایک ایسی ہستی تھے جو نہ صرف افغانستان کو زندہ کرنا چاہتے تھے بلکہ ایران مصر اور ترکی کے لئے بھی نئی زندگی لے کر آئے تھے. وہ ساری دنیا کے باشندے تھے. اور ان کی کوششیں ہر اس ملک کے لئے تھیں جو موت کے پنجے میں گرفتار تھا!

والد مکرمؒ کی وفات

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص کسی ملک کے نظام کو بدلنا چاہتا ہے وہ حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگتا ہے اور حکومت اسے خطرناک سمجھ کر اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا شروع کر دیتی ہے. یہ واقعہ سیّد صاحب کے والد

صاحب کے ساتھ بھی ہوا افغانستان کے حکمران امیر دوست محمد خاں نے ۱۲۶۲ھ میں انہیں کابل بُلا کر اُن کی جائداد پر قبضہ کر لیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ اسے جاری رکھنے کی جراءت نہ کریں۔ دس سال کے بعد جبکہ امیر قندھار کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اس نے سید صفدر کو کابل سے وطن یعنی کونر جانے کی اجازت دے دی۔ اور جائداد بھی واپس کر دی۔ سیّد صاحب اپنے محترم والد کے ساتھ کونر آ گئے۔ سید صفدر اپنی زندگی کا نیا پروگرام بنا رہے تھے۔ کہ ان کی زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا اور وہ اپنے وطن میں ۱۸۵۶ء میں فوت ہو گئے۔ اس وقت سیّد صاحب کی عمر اُنیس سال تھی!

اپنے وطن سے باہر

یہ بات ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی کہ سب سے پہلے سید صاحب نے اپنے وطن سے باہر قدم رکھا تو کس ارادے سے رکھا اور ان کے پیش نظر کیا مقصد تھا۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ صرف علم حاصل کرنے کے لئے ہندستان آئے تھے اسکے سوا ان کا کوئی اور ارادہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں ہندستان کی علمی شہرت ساری دُنیا میں پھیل چکی تھی۔ سید صاحب ہندستان آئے اور ریاضی کے علم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر حج کرنے کی غرض سے حجاز چلے گئے۔ یہاں وہ

صرف ایک سال کے قریب رہے، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہندستان میں انہوں نے صرف ریاضی کا علم ہی سیکھا، اس کے علاوہ اپنی معلومات میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ حالات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اور دیکھ رہے تھے کہ اسوقت ان کے وطن کے ارد گرد دوسرے ملکوں کی کیا حالت ہے اور کیا کچھ ہونے والا ہے۔ جن لوگوں کو دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا ہوتا ہے وہ عملی زندگی سے پہلے نہایت غور کے ساتھ اپنا پروگرام بناتے رہتے ہیں۔ اور جب یہ پروگرام مکمل ہو جاتا ہے تو فوراً کام شروع کر دیتے ہیں۔ جبوقت سید صاحب ہندستان تشریف لائے اُس وقت ملک کی حالت ایک ایسے سمندر کی سی تھی۔ جس کی سطح پر سکون ہو۔ مگر جس کی پرسکون سطح کے نیچے ایک بہت بڑا طوفان سر اٹھا رہا ہو۔ یہ ۱۸۵۶ء کا زمانہ تھا۔ یعنی ہندستان کی پہلی جنگِ آزادی کو شروع ہونے میں ابھی ایک سال باقی تھا۔ مغلیہ سلطنت ختم ہو رہی تھی۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی سارے ملک پر چھا چکی تھی۔ کوشش کے باوجود یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ ہندستان میں کہاں کہاں ٹھہرے۔ بہر حال وہ ایک سال قیام کر کے حجاز تشریف لے گئے۔ حج سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شام اور بیت المقدس میں پہنچے اور وہاں سے عراق اور فارس روانہ ہو گئے۔ ایک سال کا عرصہ اُنہوں نے ان ملکوں میں گزارا۔ جسطرح وہ ہندستان کے حالات کا جائزہ

لیتے رہے۔ ان ملکوں میں بھی انہوں نے سارا وقت غور و فکر میں گذارا اور کسی عملی پروگرام میں حصّہ لیا۔ چنانچہ وہ جس خاموشی کے ساتھ وطن سے نکلے تھے۔ اسی خاموشی سے بلوچستان ہوتے ہوئے ۱۲۷۱ھ میں افغانستان پہنچ گئے۔

جدوجہد کا آغاز

اب وہ وقت آگیا تھا کہ سیّد صاحب اس کام کا آغاز کریں جس کام کے لئے وہ دنیا میں تشریف لائے تھے۔ افغانستان پہنچکر انہیں معلوم ہوا کہ حالات بہت زیادہ بگڑ چکے ہیں۔ اور دشمن کی خفیہ کاروائیاں افغانستان کو تباہی کے غار میں دھکیل رہی ہیں اسوقت افغانستان پر امیر دوست محمد خاں حکمران تھے جو بہادر تھے مگر یورپ کے حکمرانوں کی طرح دور اندیش نہیں تھے۔ افغانستان پہنچ کر سیّد صاحب امیر افغانستان کے درباری بن گئے۔ نہ صرف بلکہ انہوں نے امیر کے صاحبزادے محمد اعظم کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی اپنے کندھوں پر اٹھالی۔ گویا وہ شہزادے کے اتالیق بھی تھے۔

اس زمانے میں ہرات پر ایران کا قبضہ تھا۔ اور امیر دوست محمد خاں

کے چچازاد بھائی سلطان احمد شاہ ایران کے حکمران کی طرف سے ہرات کے گورنر تھے، انگریز نہیں چاہتے تھے کہ ہرات پر ایران قابض رہے چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً امیر دوست محمد خاں کو ہرات پر قبضہ کرنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ جب سیّد صاحب افغانستان پہنچے امیر افغانستان ہرات پر فوج کشی کے لئے تیار تھے، حملہ ہوا۔ دونوں بھائیوں میں خونریز جنگ ہوئی اور امیر دوست محمد خاں ہرات پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن اسی زمانے میں دوست محمد خاں اور سلطان احمد خاں ہمیشہ کے لئے دنیا سے رخصت ہوگئے۔

شیر علی خاں کی تخت نشینی

امیر دوست محمد خاں کی وفات پر اصولاً محمد اعظم خاں کو حکومت کی ذمہ داری سنبھالنا چاہیئے تھی مگر مرحوم امیر کی وصیت تھی کہ ان کا چھوٹا صاحبزادہ شیر علی خاں ان کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھے۔ یہی ہوا۔ شیر علی خاں نے باپ کی وصیت کے مطابق سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اگر سیّد صاحب اپنی عقلمندی سے حالات نہ سدھارتے تو بھائیوں ہی میں کشت و خون کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ کیونکہ شیر علی خاں کے بڑے

بھائی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی موجودگی میں ان کا چھوٹا بھائی ملک کا حکمران بن جائے۔ سیّد صاحب نے بھائیوں کو سمجھایا اور انہیں لڑائی سے باز رکھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ صرف سیّد صاحب ہی کے اثر و نفوذ کا نتیجہ تھا کہ بڑے بھائی چھوٹے بھائی کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ ورنہ ایسی خونریزی ہوتی کہ افغانستان مدّت تک نہ سنبھل سکتا۔ افغانستان میں سیّد صاحب کا یہ پہلا ناقابلِ فراموش کارنامہ تھا۔

اپنے مرحوم باپ کی طرح امیر شیر علی خاں نے بھی سیّد صاحب کو اپنا مشیر و مصاحب بنا لیا۔ مگر سیّد صاحب کے قیمتی مشورے پر عمل کرنے کی بجائے اپنے بدنیّت وزیر محمد رفیق کی باتوں پر بھروسہ کرنے لگا۔ یہ اُس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ کون اسکا اور اس کی سلطنت کا وفادار ہے اور کون اقتدار حاصل کرنے کے لئے حکومت کو تباہ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔

سیّد صاحب کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ امیر شیر علی خاں اور اُن کے بھائیوں کے درمیان جو نفرت اور چپقلش بڑھتی جا رہی ہے۔ کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی رائے افغانستان کے دربار میں بڑا وزن رکھتی تھی۔ مگر اس معاملے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ امیر کا وزیر محمد رفیق امیر کو بھائیوں کے خلاف بھڑکا

رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ کوشش بھی کر رہا تھا کہ امیر سیّد صاحب کی طرف سے بدگمان ہو جائے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر سیّد صاحب کے اثر و رسوخ کا دربار میں یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں جب اس کا سارا اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ سیّد صاحب کی یہ مخالفت کوئی نئی بات نہیں تھی آپ نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہو گا کہ جو شخص دنیا میں نیکی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے، بُرے لوگ قدم قدم پر اُس کی مخالفت کر کے اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔

سیّد صاحب جب تک افغانستان کے دربار میں رہے مُلک کی ترقّی میں مصروف رہے۔ اس مختصر سے عرصے میں اُنہوں نے افغانیوں پر بہت بڑا احسان کیا ان کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔

سیّد صاحب کی اصلاحات

۱۔ سب سے پہلے تو اُنہوں نے لوگوں کو اپنے وطن اور اردگرد کے حالات سے واقف کرنے کے لئے ایک شاندار اخبار شائع کیا جس کا نام "شمس النہار" تھا۔ یہ اخبار تمام ملک میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ نہ صرف اپنے ہی مُلک میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی بھیجا جاتا تھا۔ سیّد صاحب ذاتی طور پر بڑی دلچسپی

سے اس اخبار کی ترتیب میں حصّہ لیتے تھے۔ اور اس اخبار کے ذریعے اپنے وطن والوں کو بتاتے تھے کہ اس وقت، وطن کی سب سے بڑی خدمت کیا ہے۔ اور ہم کس طرح بگڑے ہوئے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ افغانستان میں سیّد صاحب پہلے آدمی تھے۔ جنھوں نے اخبار کی ضرورت کو محسوس کیا اور افغانیوں کے دل میں اخبار بینی کا شوق پیدا کیا۔

۲۔ دوسرا کام انھوں نے یہ کیا کہ اس وقت ملک میں جتنے دفتر تھے ان کا معائنہ کیا اور انتظامی برائیوں کو دور کیا۔

۳۔ افغانی فوج کی حالت بہت خراب تھی۔ نہ تو فوج میں لوگوں کو بھرتی کرتے وقت ان کی سپاہیانہ زندگی کا خیال کیا جاتا تھا۔ اور نہ باقاعدگی کیساتھ اُن کی دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ فوج کی حالت بد سے بدتر ہوگئی تھی۔ سیّد صاحب نے اس کی طرف خاص توجہ کی اور اسے ہر طرح مضبوط بنایا تاکہ اگر دشمن کا سامنا کرنا پڑے تو مایوسی نہ ہو۔

۴۔ سیّد صاحب کا بہت بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے بچّوں کے لئے جدید اصولوں کے ماتحت سکول کھلوائے۔ اور تعلیم کی ترقّی کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ آپ جانتے ہیں جس ملک میں تعلیم کی حالت خراب ہو، وہ ملک کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ سیّد صاحب نے قوم کے بچّوں کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق دلایا۔ اور اس سلسلے میں ہر ممکن سہولت

بہم پہنچائی۔

۵۔ افغانستان میں سید صاحب کے وقت بہت کم ہسپتال تھے۔ اور جو تھے وہ بھی غریبوں کے لئے نہیں تھے۔ غریب بیچارے طرح طرح کے بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر رہے تھے۔ یہ بات قوم کے لئے بہت بڑا خطرہ تھا۔ سیّد صاحب نے پبلک کے لئے سرکاری شفاخانے قائم کرائے۔ ان شفاخانوں میں علاج معالجے پر جو کچھ خرچ ہوتا تھا حکومت کی طرف سے ہوتا تھا۔

۶۔ سیّد صاحب کی اصلاحات سے پہلے ڈاک کا انتظام بہت ناقص تھا۔ لوگوں کو بڑی دقّت کے بعد کہیں جا کر خط ملتا تھا۔ سیّد صاحب نے اس محکمے کی تمام برائیوں کو دور کیا اور ڈاکخانوں کے جو اصول یورپ میں رائج تھے۔ انہی اصولوں کے ماتحت اپنے وطن کے ڈاکخانوں کی اصلاح کی۔

۷۔ وزیروں کی ایک مجلس بنائی جو حکمران کو ہر معاملے میں اپنی رائے سے آگاہ کرتی تھی! اس مجلس میں ایسے آدمی شامل تھے جو تجربہ کار بھی تھے اور دل و جان سے ملک کے خیر خواہ بھی۔

۸۔ سیّد صاحب نے اپنے سفیر دوسرے ملکوں میں بھیجے تاکہ دوسرے ملکوں کے حالات معلوم ہوتے رہیں اور تعلقات بھی مضبوط رہیں!

ان اصلاحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیّد صاحب افغانستان کو ترقّی کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ اُن کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی۔ کہ وہ افغانستان جو دُنیا کے ترقی یافتہ ملکوں سے بہُت پیچھے ہے۔ ترّقی کر کے اُن میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے رات دن محنت کر کے ملک کی بُنیادی بُرائیوں کو دُور کیا۔ اور ہر محکمے میں نئے اصول رائج کئے۔ افغانستان بدقسمت ملک تھا کہ وہ زیادہ دیر تک سیّد صاحب کی موجودگی سے فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ دربار کی فضا بہُت خراب ہو گئی۔ امیر شیر علی نے محمد رفیق کے مشورے پر عمل کر کے اپنے بھائیوں سے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بدقسمتی سے شیر علی کے دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی تھی۔ کہ اگر اس کے بھائی افغانستان میں رہے تو اس کی حکومت کو ہر وقت خطرہ رہے گا۔ اور ممکن ہے کسی دن اُسے تاج وتخت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ سیّد صاحب نے جب یہ بگڑے ہوئے حالات دیکھے اور معلوم کر لیا کہ اب ان کی کوششوں سے شیر علی کا ارادہ بدل نہیں سکتا تو اُنہوں نے وطن چھوڑنے کی تیّاری مکمل کر لی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ وطن سے باہر قدم رکھیں اُنہوں نے خفیہ طور پر امیر شیر علی کے بھائیوں کو اطلاع دیدی کہ اب اُن کی زندگی خطرے میں ہے۔ چنانچہ سیّد صاحب کے مشورے کے مُطابق محمد اعظم، محمد اسلم اور محمد امین۔ امیر شیر علی کے تینوں بھائی اپنے اپنے علاقوں کو چلے گئے۔

ہندستان میں آمد

سیّد صاحب چاہتے تھے کہ کچھ عرصہ اپنے وطن سے باہر رہیں۔ تاکہ امیر شیر علی اور ان کے بھائیوں میں جو جنگ چھڑنے والی ہے اسمیں کوئی حصّہ نہ لے سکیں۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ اس جنگ کا نتیجہ جو نکلے گا وہ مُلک کے لیئے نقصان دہ ہوگا۔ سیّد صاحب اپنے وطن سے نکل کر ہندستان چلے گئے۔ اس مرتبہ بھی اُنھوں نے کسی عملی پروگرام میں حصّہ نہیں لیا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ ہندستان کے کس کس علاقے میں ٹھہرے۔ اس سفر کے حالات معلوم نہیں ہوسکے۔ شاید وہ خاموشی کے ساتھ اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں سوچتے رہے۔

سیّد جمال الدین کے جانے کے بعد افغانستان میں حالات اور بگڑ گئے اور امیر شیر علی نے کھُلم کھُلا بھائیوں کے خلاف کاروائی شروع کردی۔ سب سے پہلے اس نے محمد اعظم خاں پر فوج کشی کی۔ محمد اعظم نے مقابلہ تو کیا مگر شکست کھائی۔ چنانچہ وہ ہندستان چلا گیا۔ ایک بھائی سے فراغت پاکر وہ دوسرے بھائیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ قندھار میں محمد امین خاں قتل ہوگئے۔ لیکن اس جنگ میں امیر شیر علی کا اپنا بیٹا بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ امیر کو

اس واقعے کی اطلاع نہیں تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اُن کا بیٹا صحیح وسلامت واپس آ رہا ہے۔ چنانچہ جب وقت امیر شیر علی کے سامنے اُن کے مقتول بھائی محمد امین کی لاش لائی گئی تو وہ غرور کے نشے میں بولے۔ لے جاؤ اس لاش کو اور میرے بیٹے سے کہو کہ اس شاندار کامیابی پر مجھے مبارکباد دے۔" امیر شیر علی نے یہ فقرہ بلند آواز سے کہا تھا۔ اور اس کا چہرہ خوشی سے سُرخ تھا وہ انتظار کر رہا تھا کہ اس کا بیٹا آئے اور مبارکباد دے۔ اور اُس کے بعد وہ اپنے بیٹے سے کہے۔ میرے بعد سارا افغانستان تمہارے قبضے میں ہوگا میں اپنی زندگی میں ہی تمہارے چچاؤں کا خاتمہ کر رہا ہوں۔ اسی وقت لوگ اس کے بیٹے کی لاش اس کے سامنے لے آئے۔ اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھکر اس کے ہوش وحواس گم ہو گئے۔ اور صورت حال یہ تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، محمد اعظم خاں ہندستان سے کابل کے قریب پہنچ گئے۔ اور حملے کی تیاریاں کرنے لگے۔ شیر علی کے بیٹے ابراہیم نے مقابلہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکا اور بُری طرح شکست کھائی۔ اب شیر علی بلندی سے گر چکا تھا۔ محمد اعظم خاں نے کابل پہنچتے ہی امیر شیر علی کے وزیر محمد رفیق کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ کیونکہ اس لڑائی کی ذمہ داری اس کی ذات پر عاید ہوتی تھی، امیر شیر علی ہرات بھاگ گیا۔

واپس کابل میں

محمد اعظم خاں سریر آرائے سلطنت ہو گئے تخت پر بیٹھتے ہی اُنہوں نے سیّد صاحب کو بُلا لیا۔ اُن کی بڑی عزّت کی اور کافی اختیارات دیئے سیّد صاحب ملک کی بہتری کے لئے ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اور امیر شیر علی کے زمانے میں جو بُرائیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اُنہیں دور کرنے کا انتظام کرنے لگے۔

سیّد صاحب ڈیڑھ سال تک وزیر رہے ابھی اُن کے پروگرام کا صرف ایک حصّہ ہی پورا ہوا تھا کہ محمد اعظم خاں اور سردار عبدالرحمٰن میں چل گئی، محمد اعظم خاں نے سردار عبدالرحمٰن کو بلخ کا گورنر مقرر کر کے کابل سے بھیجدیا ملک کی یہ نئی بد قسمتی تھی۔ سیّد صاحب نے ہر چند کوشش کی کہ دونوں میں صُلح ہو جائے اور معاملہ یہیں رُک جائے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ محمد اعظم خاں نے سیّد صاحب کے مشوروں کی طرف توجہ نہ کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے درمیان دشمنی بڑھتی گئی۔ اس وقت شیر علی ہرات میں تھا۔ وہ موقعے کی تلاش میں تھا۔ جب اس نے موقع دیکھا انگریزوں سے مدد لے کر کابل پر حملہ کر دیا محمد اعظم بڑے تند مزاج آدمی تھے اس لئے اُن کے دوست اُن سے دُور

دُور رہتے تھے ۔ محمد اعظم خاں شکست کھا کر مشہد کی طرف چلے گئے۔ اور شیر علی فاتح کی حیثیت سے کابل میں داخل ہو گئے۔ شیر علی کا فاتح بن کر افغانستان کی زمین پر داخل ہونا سید صاحب کے لئے بہت بڑا خطرہ تھا۔ سید صاحب خوب جانتے تھے کہ شیر علی کسی طرح بھی ان کی موجودگی کو خاموشی کیساتھ برداشت نہیں کر سکتے اس لئے اُنہوں نے بہتر سمجھا کہ وطن سے نکل کر باہر کی دُنیا میں وہ کام شروع کر دیں جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُنہیں پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے شیر علی سے حج کرنے کی اجازت مانگی۔ شیر علی اور کیا چاہتا تھا۔ فوراً اجازت دے دی۔ سید صاحب نئے ارادوں، نئے ولولوں اور نئی اُمنگوں کے ساتھ اپنے وطن سے باہر آئے۔ وہ تن تنہا تھے مگر دل میں ہمت کی کمی نہیں تھی۔ سفر میں خرچ کرنے کے لئے جیب میں کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن سینے میں ایمان کا جوش برپا تھا۔ وہ اکیلے، بے یار و مددگار دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی ٹکر لینے کے لئے تیار تھے۔ جس شخص کا ارادہ بلند ہو، اور سخت سے سخت قربانی کرنے پر تُلا ہو۔ اُسے کوئی طاقت ڈرا نہیں سکتی۔

سیّد جمال الدین افغانی کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمت والے شخص کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ آپ نے اسی مطلب کا ایک شعر پڑھا ہوگا۔ مشہور شعر ہے ؎

وہ کون سا عُقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمّت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

ہندستان میں تیسری مرتبہ

سیّد صاحب ہند ستان میں تیسری مرتبہ آئے۔ اس مرتبہ بہُت کم مُدت یہاں رہے یعنی صرف ایک مہینہ۔ تیسری مرتبہ بھی اُن کے قیامِ ہند ستان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ ہند ستان سے سیّد صاحب مصر روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچکر اُنھوں نے مصری یونیورسٹی "جامعہ ازہر" کے طالب علموں سے تعلقات بڑھائے اور اُنہیں بتایا کہ اُن کے اپنے ملک میں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے اگرچہ سیّد صاحب طالب علموں کو سبق پڑھاتے تھے مگر اسی پڑھنے پڑھانے کے دوران میں وہ اُنہیں ایسی باتیں بھی بتا دیتے تھے۔ جو اُنہیں مصر کا کوئی اور عالم نہیں بتا سکتا تھا۔ اور جنہیں جاننا سخت ضروری تھا۔ مصر کے نوجوان اُن کی بڑی عزت کرتے تھے اور اُنہیں اپنا حقیقی راہنما سمجھتے تھے۔ برطانوی حکومت کو یہ امر ہرگز پسند نہیں تھا۔ وہ ڈرتی تھی اگر سیّد صاحب اسی طرح اقتدار اور عزّت حاصل کرتے گئے تو وہ مصر میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ سیّد صاحب

تو جس ملک میں جاتے تھے وہیں لوگوں کو یہ سبق دیتے تھے کہ غیروں کی غلامی ہرگز قبول نہ کرو۔ آزادی زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اگر یہ نعمت چھن گئی تو تمہارے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا۔

برطانیہ کی حکومت کوشش کرنے لگی کہ جس طرح بھی ممکن ہو سیّد صاحب کو مصر سے نکال دے۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے اُس نے وہی طریقہ اختیار کیا جو ایک چالاک حکومت کو اختیار کرنا چاہیئے۔ یعنی اُس نے خدیو مصر کو مجبور کیا کہ وہ سیّد صاحب کو مصر سے نکال دے۔

اسی زمانے میں ایک نصرانی سیّد صاحب کی باتیں سُن کر مسلمان ہو گیا۔ برطانیہ کو ایک بہانہ مل گیا۔ چنانچہ اس نے اس واقعے سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور سیّد صاحب کو مجبور کر دیا کہ وہ فی الفور مصر سے چلے جائیں۔

سیّد صاحب مصر سے چلے گئے۔ مگر ان کے قیامِ مصر سے دو خاص فائدے حاصل ہوئے۔ اور یہ ایسے فائدے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ مصری اپنے وطن سے زیادہ محبت کرنے لگے اور اُن کی نظروں میں آزادی بہت بڑی نعمت بن گئی جس کے لئے وہ اپنی جانیں بھی قربان کر سکتے تھے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مصری اب تک اپنی آزادی کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔ آزادی کے بیج سب سے پہلے سیّد صاحب ہی نے

اُن کے دل میں بوئے تھے۔ وہ زیادہ تر طلبا کو اپنی باتیں سنایا کرتے تھے۔ ہر ملک کی طاقت اس کے طالب علم ہوتے ہیں۔ اگر طالب علم ہمت والے، مصیبتوں کا مقابلہ کرنے والے، محنتی اور اچھے اخلاق والے ہوں تو وہ ملک بہت جلد ترقی کر سکتا ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے طالب علم کاہل، محنت سے جی چرانے والے اور بزدل ہوں تو پھر ملک کا خدا حافظ۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مصر میں سیّد صاحب کو ایک ایسا شخص مل گیا جس نے بعد میں سیّد صاحب کے ساتھ مل کر بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ اس شخص کا نام شیخ محمد عبدہٗ ہے

سیّد صاحب ترکی میں

مصر چھوڑنے کے بعد سید صاحب دوسری بڑی اسلامی سلطنت ترکی میں پہنچے۔ یہ زمانہ ترکی کے لئے بڑا خطرناک تھا۔ یورپ کی طاقتیں نئے نئے فتنے اٹھا کر اس کی قوّت کو ختم کر رہی تھیں۔ ملک میں بھی شورش برپا تھی رعایا کو چین سے زندگی بسر کرنا نصیب نہیں تھا۔ حکومت سخت اُلجھن میں گرفتار تھی کہ کرے تو کیا کرے۔ ان بگڑے ہوئے حالات میں بھی چند لوگ ایسے موجود تھے جو یورپ کی فریب کاریوں کو اچھی طرح سمجھ کر ملک

کو ان کے چنگل سے نکالنا چاہتے تھے۔ اور ہر وقت اسی کوشش میں مصروف تھے۔ یہ لوگ ترکانِ احرار تھے۔ جو وطن کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا کر میدان میں اترے تھے۔

ان حالات میں سیّد صاحب قسطنطنیہ پہنچے۔ چند روز کے بعد ہی اُن کی ملاقات ترکی کے وزیر اعظم عالی پاشا سے ہو گئی۔ دونوں میں دیر تک ملکی سیاست پر باتیں ہوئیں۔ وزیر اعظم اسلام کے اس زندہ جاوید ہیرو کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ سیّد صاحب کی یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ سچائی بیان کرنے میں کسی سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ جو کچھ دل میں ہوتا تھا صاف صاف کہہ دیتے تھے اور پھر ان کے بیان کرنے کا ڈھنگ۔ اسقدر پاکیزہ اور پُرجوش ہوتا تھا کہ سننے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ سیّد صاحب نے وزیر اعظم کو بتایا کہ اسوقت ترکی موت کے دروازے پر پہنچ چکا ہے۔ یورپ کی مختلف طاقتیں اس کے حصے بخیے کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ رعیّت حکومت سے نالاں ہے۔ اگر اس کے نقائص دور نہ کئے گئے اور یورپ کی طاقتوں کو روکا نہ گیا تو دُنیا کے نقشے سے ترکی کا نام ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے گا بعد میں پچھتانا فضول ہوگا۔ اگر فرض کا احساس ہے تو اس وقت اپنا فرض ادا کیجئے۔

سیّد صاحب کی یہ سچی باتیں سُن کر وزیر اعظم کانپ اُٹھا۔ اور اُس نے

سیّد صاحب کی خدمت میں درخواست کی کہ وہ ترکی میں نیا تعلیمی پروگرام بنا کر لوگوں کو اس پر عمل کرائیں۔ اپنے جوہر دکھانے کا یہ اچھا موقعہ تھا۔ سیّد صاحب فوراً رضامند ہو گئے اور کام شروع کر دیا۔

سیّد صاحب جابجا لیکچر دینے لگے اور سوئی ہوئی ترکی قوم کو بیدار کرنے لگے۔ وہ جس جگہ بھی تقریر کرتے تھے لوگ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ ان کی تقریریں لوگوں کو اتنا متاثر کرتی تھیں کہ ترکی انہیں "سحر القلوب" کہنے لگے تھے۔ سحر القلوب کا مطلب ہے دلوں کا جادو۔ سیّد صاحب واقعی دلوں پر جادو کا اثر کرتے تھے۔ کیا مجال کہ کوئی شخص ان کی باتیں سُنے اور اس کے اندر جوش نہ پیدا ہو جائے!

اب سیّد صاحب کی شہرت صرف ترکی ہی میں محدود نہ تھی۔ بلکہ ترکی کی حدوں سے نکل کر تمام دُنیا میں پھیل گئی تھی۔ اسلامی سلطنتوں کے عقلمند لوگ سمجھنے لگے تھے کہ ان کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے سچا راہنما بھیجا ہے اور یورپ کی حکومتیں جان چکی تھیں کہ اگر اس شخص کا خاتمہ نہ کیا گیا تو اسلامی ملکوں میں ان کی عظمت برقرار نہیں رہے گی۔

سیّد صاحب رات دن اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ انہیں نہ تو اپنی صحت کا خیال تھا اور نہ مخالفوں کی مخالفت کا ڈر۔ جو شخص صداقت شعاری کو اپنا اصول بنا لے اُسے دُنیا کی کون طاقت ڈرا سکتی ہے؟

جیسا کہ قاعدہ ہے، جو شخص جتنا مقبول ہوگا اسی قدر اُس کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا بھلا ترکی کے پرانے خیالات کے عالم یہ کیوں کر برداشت کر سکتے تھے کہ عزت و شہرت کے لحاظ سے جمال الدین اُن سب سے آگے نکل جائے۔ سیّد صاحب اور اُن کے خیالات میں بنیادی فرق تھا۔ سیّد صاحب جس نقطۂ نظر سے حالات کو جانچتے تھے، وہ ترکی کے شہرت پسند عالموں کا نقطۂ نظر نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر وہی ہُوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ ترکی کے شیخ الاسلام اور ان کی پارٹی کی طرف سے مخالفت کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ ترکی کے دشمن بھی ان لوگوں کی مدد کر رہے تھے۔ جو سیّد صاحب کے مخالف تھے۔ سیّد صاحب کو نقصان پہنچانے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا۔

ترکی میں سیّد صاحب کے بڑے بڑے عالم حامی بھی تھے۔ اُن میں وزیر اعظم عالی پاشا، سلیمان بلخی اور حنیف پاشا تھے۔ جامعہ قسطنطنیہ کے صدر تحسین آفندی بھی سیّد صاحب کی جماعت میں شامل تھے۔ مگر ان چند آدمیوں کی کوشش اتنی بڑی مخالفت کا کیوں کر مقابلہ کر سکتی تھی؛ بدقسمتی سے اس وقت ترکی کے تخت پر ایک ایسا شخص بیٹھا جو مخالفت سے بڑی جلد دب جاتا تھا۔ سید صاحب کی مخالفت روز بروز بڑھتی گئی۔ آخر وہ ترکی سے نکل آئے!

جب سیّد ترکی سے نکلے تو ان کی شخصیت کی شہرت ساری دنیا میں پھیل چکی تھی۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں جو لوگ سیاسی معاملات میں دلچسپی لیتے تھے، وہ ان کی ذات کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ اگرچہ سیّد صاحب ترکی میں زیادہ عرصہ قیام کرکے اپنے پروگرام پر عمل نہ کر سکے۔ تاہم جو آگ اُنھوں نے غلام ملکوں میں روشن کی تھی اُس کی چنگاریاں چاروں طرف پھیل گئی تھیں اور وہ وقت قریب آرہا تھا کہ یہ چنگاریاں شعلوں کی صورت میں بھڑک اُٹھیں۔ اور یہ چیز سیّد صاحب کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ ایک ایسی کامیابی تھی جو دنیا کے بہت کم لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے۔

دوبارہ مصر میں

قسطنطنیہ سے نکل کر سیّد صاحب ۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو مصر میں پہنچے۔ اس وقت مصر کے تخت پر اسمٰعیل پاشا متمکن تھا۔ اور مصر کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہونے والا تھا۔ یہ خدیو مصر بہت نالائق اور فضول خرچ تھا۔ ملک کا سارا روپیہ اُس کی فضول خرچیوں پر ختم ہو رہا تھا۔ رعیّت بھوکوں مر رہی تھی۔ مُلک کا روپیہ ختم کرنے کے بعد

اسمٰعیل پاشا یورپ کی حکومتوں سے قرض لینے لگے اور یہ قرض برابر بڑھتا جارہا تھا۔ حالت یہاں تک جا پہنچی تھی کہ برطانیہ اور فرانس نے مصر کی مالی حالت کی نگرانی اپنے ذمے لے لی تھی۔ یہ ایک قسم کا دیوالیہ پن تھا۔ اسمٰعیل نے سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ اپنی عیّاشی کی خاطر نہر سویز کے حصّے بھی فروخت کردیئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ سویز کے معاملات میں مصر کی حکومت کو کوئی دخل دینے کا حق نہیں تھا۔ خدیو اسمٰعیل نے مُلک کو بُری طرح تباہ کردیا تھا۔ اسے صرف اپنی عیّاشی کا خیال تھا رعیّت کی فکر نہیں تھی!

مصر میں چند آدمیوں نے یہ محسوس کرکے کہ حالت بہُت زیادہ خراب ہوگئی ہے ایک چھوٹی سی جماعت کی شکل اختیار کرلی تھی اور یہ جماعت مصر سے دشمنوں کا دخل ہٹانے کے لئے ایک لائحہ عمل مرتب کررہی تھی سیّد صاحب اسی جماعت پر بھروسہ کرکے مصر پہنچے اور اسی جماعت کے ساتھ مل کر کام شروع کردیا۔

جب سیّد صاحب مصر میں پہلی مرتبہ پہنچے تھے تو اُنہوں نے نوجوانوں کے دلوں میں نئی آگ بھڑکا دی تھی۔ وہ آگ ابھی تک اُن کے سینوں میں روشن تھی۔ چنانچہ جسوقت سیّد صاحب دوبارہ مصر میں آئے۔ تو ان نوجوانوں نے بڑے جوش وخروش کے عالم میں ان کا استقبال کیا۔ اور

ان کی آمد کو خدا کی رحمت سمجھا. حقیقت یہ ہے کہ ایسی مشکلات میں گھری ہوئی قوم کے لئے سیّد صاحب سے بڑھکر کوئی اور راہنما نہیں ہو سکتا تھا.

مصر میں کام شروع تو نہیں ہوا تھا مگر کام کے لیے کافی گنجائش تھی یوں سمجھیے کہ مکان تعمیر تو نہیں ہوا تھا لیکن اینٹیں بھی موجود تھیں مصالحہ بھی تیار تھا اور کام کرنے والے آدمی بھی آمادہ کار تھے۔

سیّد صاحب کی مصر میں آمد کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ جیسے ہی اُنہوں نے مصر کی سرزمین پر قدم رکھا ان کے عقیدتمند جوق در جوق اُن کی خدمت میں حاضر ہونے لگے. مصر یونیورسٹی یعنی جامعہ ازہر کے طالب علموں نے سیّد صاحب کی خدمت میں درخواست کی کہ وہ مصر ہی کو اپنا وطن بنائیں۔ ہمیشہ وہیں رہیں، اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت میں حصّہ لے کر اُنہیں وطن کے بہادر سپاہی بنائیں. خود مصر کے وزیر اعظم ریاضی پاشا بھی ان کے پاس پہنچے اور اصرار کیا کہ آپ دیر تک ہمارے ملک میں رہیں کیوں کہ موجودہ حالات اس قسم کے ہیں کہ آپ جیسا آدمی ہی اُن کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

مصر میں قدم جاتے ہی سیّد صاحب نے سب سے پہلے طالب علموں کی طرف توجہ کی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر مصر کی نئی نسل اپنے فرائض سمجھ جائے گی تو کوئی مشکل مشکل نہیں رہے گی۔

شروع شروع میں وہ جامعہ کے اندر طالب علموں کو درس دیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے پرانی کتابوں کی بجائے نئی کتابوں کو نصاب میں داخل کیا اور اپنے شاگردوں کو پرانے زمانے کی باتیں سنانے پر ہی اکتفا نہ کی۔ بلکہ نئے زمانے کی باتیں بھی بتائیں۔ طالب علم ان کے لیکچروں کو بڑے ذوق وشوق سے سُنا کرتے تھے۔ اور ان کے ایک ایک حرف کو لکھ لیتے تھے۔ ان کے لیکچر بھی خزانے ہوتے تھے۔ جنہیں اُن کے شاگرد بہت عزیز سمجھتے تھے۔

سیّد صاحب اپنے شاگردوں کو صرف سبق ہی نہیں پڑھاتے تھے ان کے اندر کام کرنے کا جوش بھی پیدا کر دیتے تھے۔ سیّد صاحب کے شاگردوں میں ایسے شخص بھی شامل تھے جو بعد میں نامی گرامی ہستیاں ثابت ہوئیں۔ مثلاً مفتی عبدہٗ، ادیب اسحٰق، شیخ ابراہیم الاغانی محمد بک موبلجی، ابراہیم بک موبلجی۔

مصر میں سیّد صاحب نے وطن کی خدمت کے لئے ایک انجمن قائم کی تھی جس کا نام "محفل وطن" تھا اس انجمن کے مقاصد بہت اونچے تھے۔ اور جو شخص اس انجمن کی کارکن بنتا تھا اس کا فرض تھا کہ اُن مقاصد کو پورا کرے۔ سیّد صاحب کی خواہش تھی کہ مصر کے لوگ سچے مسلمان بن جائیں چنانچہ اسی بات کو مدنظر رکھکر اُنہوں نے ایسے اصول بنائے تھے جن پر کاربند ہو کر

ہر شخص دنیا میں بھی کامیاب ہو سکتا ہے اور آخرت میں بھی۔ ایک ہی مہینے میں "محفلِ وطن" کے ممبروں نے یہ کام کیا۔

۲۵۰۰۰ (پچیس ہزار) بُرے آدمیوں سے توبہ کرائی گئی کہ آئندہ وہ کوئی بُرا کام نہیں کریں گے۔

۱۵۰۰ (پندرہ سو) مریضوں کی خدمت کی گئی۔

۵۰۰ (پانچ سو) فقیروں اور محتاجوں کو روٹی کپڑا دیا گیا۔

۵۰۰ (پانچسو) امیروں نے عیّاشی کا سامان بیچ کر سارا روپیہ نیک کاموں میں صرف کر دیا۔

۷۵ (پچھتر) غریبوں کو تجارت کرنے کے لئے روپیہ دیا گیا۔ یہ لوگ باعزت کام کر کے روٹی کمانا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے پاس تجارت کرنے کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ سیّد صاحب کی باتیں سُن کر محفلِ وطن کے ممبروں نے ان غریب لوگوں کو روپیہ دیا تاکہ کام کر کے باعزت طور پر زندگی بسر کر سکیں!

۲۵۶ فقیروں کو خیرات دی گئی۔

"محفلِ وطن" کا قیام ایک ایسا کارنامہ تھا جس نے مصریوں کی کایا پلٹ دی۔ غور کیجئے مہینے کے تیس دنوں میں اللہ کے نیک بندوں نے کتنا بڑا کام کر دکھایا۔ جب اولوالعزم لوگ کام شروع کرتے ہیں تو کسی رکاوٹ کی پروا نہیں

کرتے۔ ان کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے ہیں۔

یہ انجمن کچھ عرصے کے بعد بند ہو گئی۔

سیّد صاحب قومی ترقی کے لئے اخبار کی اشاعت کو بہت اہمیّت دیتے تھے۔ وہ خود بہت بڑے اخبار نویس تھے اور اخبار نویسی کے مقاصد کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے مصریوں کے اندر اخبار نویسی اور اخبار بینی کا شوق پیدا کیا۔ اسوقت اگرچہ کئی اخبار شائع ہُوئے تھے۔ مگر ایک اخبار بھی اعلیٰ معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ جیساکہ کسی پچھلے صفحے میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ سیّد صاحب کے کئی ایسے شاگرد تھے۔ جنہوں نے بعد میں بڑی شُہرت حاصل کی۔ ان میں ادیب اسحٰق نمایاں ہیں۔ ادیب اسحٰق پہلے مصری ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ایک شاندار اخبار نکالا۔ اس اخبار کا نام "مصر" تھا۔ ادیب اسحٰق کی عمر اسوقت اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھی مگر سیّد صاحب کی تعلیم نے ان کے اندر علم حاصل کرنے اور اپنا علم دوسروں تک پہنچانے کی بہت بڑی خوبی پیدا کر دی تھی۔ ادیب اسحٰق سیّد صاحب کے لیکچر اپنے اخبار میں شائع کرتے تھے۔ اس طرح ایک تو اخبار کی اشاعت بڑھتی جاتی تھی اور دوسرے سیّد صاحب کی باتیں دُور دُور تک پہنچ جاتی تھیں۔ مصر کے علاوہ سیّد صاحب کی نگرانی میں ایک اور اخبار بھی شائع ہوتا تھا۔ اس کا نام "ابو نظارا" تھا۔ اس کا ایڈیٹر ایک یہودی جمیس سنا تھا۔

یہ شخص پہلے پہل سیّد صاحب کا شدید مخالف تھا مگر بعد میں ان کا سچا عقیدتمند بن گیا۔

خدیو مصر اسمٰعیل پاشا مصر کا برائے نام حکمران تھا۔ ملک پر درپردہ ملک کے دشمن حکومت کر رہے تھے۔ سیّد صاحب کے لئے یہ بات سوہان روح سے کم نہ تھی۔ وہ توفیق کی مدد کر رہے تھے، توفیق ایک پرجوش مصری تھے۔ جو اہل مصر میں بہت مقبول تھے۔ سید صاحب نے سوچا اگر اسمٰعیل کی بجائے توفیق مصر کے تخت پر بیٹھ جائے تو مصر کی ساری مشکلات دور ہو جائیں گی۔

انہی دنوں برطانیہ نے اسمٰعیل پاشا پر زور ڈالا کہ وہ مستعفی ہو جائیں اگر وہ مستعفی نہ ہوتے تو سید صاحب کے آدمی ضرور اسے کسی نہ کسی طرح تخت سے اتار دیتے۔

اسمٰعیل پاشا کے بعد توفیق خدیو مصر بن گئے۔ یہ واقعہ ۲۶ جون ۱۸۷۹ کو ہوا۔

توفیق کے تخت پر بیٹھتے ہی مصر کے قوم پرستوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور انہیں امید تھی نیا خدیو مصر کی خدمت کرے گا۔ اس کی ترقی کے لیے کوشش کرے گا۔ اور اسمٰعیل پاشا کی طرح کبھی بھی اپنے عزیز وطن کو اغیار کے سپرد نہیں کرے گا!

مصر کے تمام قوم پرستوں کو یقین تھا کہ توفیق مصر کے تخت پر بیٹھتے ہی قوم پرستی کے جذبے کو ترقی دے گا۔ اور جتنی برائیاں پیدا ہوتی چلی آرہی ہیں ان سب کو دور کردے گا مگر معاملہ اس کے برعکس ثابت ہوا۔ توفیق پاشا اب تک قوم پرستوں کو دھوکہ دے رہا تھا۔ وہ اصل میں مصر کی حکومت چاہتا تھا اور چونکہ اس وقت مصر میں قوم پرستوں کا زور تھا اس لئے وہ قوم پرستوں کی حمایت حاصل کرکے تخت تک پہنچنا چاہتا تھا۔ جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو اسے کیا غرض پڑی تھی کہ ان وعدوں کو پورا کرتا جو تخت پر بیٹھنے سے پہلے وہ قوم پرستوں سے کرچکا تھا۔ دوسری طرف قوم پرستوں کا مطالبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کب تک اپنے آپ کو چھپا سکتا تھا۔ اصلی رنگ میں ظاہر ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ تخت پر بیٹھنے سے ایک ماہ بعد اُس نے سیّد صاحب کی جماعت کے معزز رکن شریف پاشا کو وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹا دیا اور ان کی بجائے اپنے آدمی ریاض پاشا کو وزیر اعظم بنا لیا۔ سلطنت میں وزیر اعظم کی بہت بڑی حیثیت ہوتی ہے۔ وہ ملک کو بستی میں بھی گرا سکتا ہے اور بلندی کیطرف بھی لے جا سکتا ہے۔ قوم پرستوں نے جب دیکھا کہ توفیق نے اُن کو سخت دھوکہ دیا ہے تو ان کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں وہ سمجھ گئے کہ اسمٰعیل پاشا کی طرح توفیق بھی غیروں کے اشاروں پر کام کر رہا ہے۔

غیر جب شریف پاشا ہی کو وزیر اعظم کے مرتبے پر نہ دیکھ سکے

تو وہ سیّد جمال الدین کو مصر میں کیونکر دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے توفیق پر زور ڈالا کہ کسی طرح اس شخص کو مصر سے نکال دو۔ اور توفیق انہیں مصر سے نکالنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگا۔ آخر کوئی نہ کوئی بہانہ اُس کے ہاتھ آ ہی گیا!

سیّد صاحب مصر سے کسطرح نکلے — یہ ایک اچھا خاصہ واقعہ ہے۔

سیّد صاحب اپنے گھر میں سو رہے تھے کہ رات کے دو بجے کسی نے ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سیّد صاحب نے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ فوج کا ایک دستہ اُن کو گھیرے میں لئے کھڑا ہے۔ اسی وقت اُنہیں سپاہیوں کی کڑی نگرانی میں سویز بھیج دیا گیا۔ وہاں ایران کے سفیر نے اُن کی خدمت میں تین ہزار پونڈ پیش کئے کہ آپ بے کسی کے عالم میں ہیں۔ خرچ کرنے کے لئے رکھ لیجئے۔ سیّد صاحب نے حقارت کے ساتھ ان سکّوں کی طرف دیکھا اور بولے۔ "اس رقم کو تم اپنے پاس رکھو۔ مجھ سے زیادہ تم کو ان کی ضرورت ہے شیر تو جہاں جاتا ہے اپنے لئے غذا پیدا کر لیتا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو خدا اور اپنی ہمّت پر بھروسہ ہو۔ وہ معمولی باتوں کی پروا نہیں کرتا

توفیق نے ان کے عزیز ترین شاگرد شیخ عبدہٗ کو بھی بند کر دیا کیونکہ ڈر تھا جو کام سیّد صاحب نے شروع کیا ہے ان کے جانے کے بعد یہ شخص کرتا رہے گا!

اس کے بعد سیّد صاحب کبھی مصر نہ پہنچ سکے اور اُنہیں پہنچنے کی ضرورت

بھی کیا تھی، مصر میں انہوں نے ایسے آدمی پیدا کر دیئے تھے جو مصر میں انقلاب برپا کر سکتے تھے۔ اور سیّد صاحب کی طرح مصریوں کے راہنما ثابت ہو سکتے تھے!

ہندستان میں چوتھی مرتبہ

مصر سے نکلنے کے بعد سید صاحب ہندوستان پہنچے، سب سے پہلے بمبئی پہنچے اور وہاں سے حیدر آباد دکن روانہ ہو گئے۔ ہندستان میں اُنکی علمی شہرت کافی پھیل ہوئی تھی اس لئے حیدر آباد کے اہل علم طبقے نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ہر روز طالب علم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور سید صاحب کی باتوں سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے تھے!

سیّد صاحب نے ہندستان میں نہ تو کوئی سیاسی انجمن بنائی اور نہ اس ملک کی سیاسیات میں حصّہ لیا۔ وہ لوگوں کی تعلیم اور اصلاح کی طرف متوجہ رہے اور اسی کام پر اپنا وقت صرف کرتے رہے۔

آپ جانتے ہیں اسوقت حیدر آباد دکن میں سب مضامین اردو زبان میں پڑھائے جاتے ہیں، یہ تحریک سیّد صاحب ہی نے شروع کی تھی انہوں نے وہاں کے عالموں سے کہا کہ آپ لوگ نئے علموں کی کتابیں اردو زبان

میں شائع کرکے بچّوں کو پڑھائیں. غیر زبان میں پڑھاتے ہوئے علم بچّوں کے ذہن نشین ہو سکتے!

چنانچہ سب معلوم اردو زبان میں ترجمہ ہو کر طالب علموں کے نصاب بن گئے!

سیّد صاحب ہندستان میں بہت کچھ کرنا چاہتے تھے کہ اچانک برطانیہ کی حکومت نے آپ کو گرفتار کرکے کلکتہ پہنچا دیا. وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مصر میں اعرابی پاشا جو وزیر جنگ برطانیہ کے خلاف سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے. انگریز چاہتے تھے کہ انہیں گرفتار کرکے جلاوطن کردیں اور ساتھ ہی اُنہوں نے جو تحریک شروع کی ہے اس کا خاتمہ کردیں. چونکہ اعرابی پاشا سیّد صاحب ہی کی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے. اس لئے اعرابی پاشا کے ساتھ اُنہیں بھی نظربند کردیا گیا تاکہ وہ ہندستان میں شورش برپا نہ کرسکیں.

لندن میں

۱۸۸۴ء میں سیّد صاحب کلکتہ سے روانہ ہوکر لندن پہنچے. بعض لوگ کہتے ہیں کہ سیّد صاحب پہلے امریکہ گئے اور پھر لندن. وہ امریکہ کیوں گئے یہ

معلوم نہیں ہو سکا۔ ظاہر ہے کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہوگی سید صاحب ہر کام اور ہر بات کسی خاص مصلحت کے ماتحت کیا کرتے تھے۔ جو قدم اُٹھاتے تھے سوچ سمجھ کر اٹھاتے تھے۔

پیرس میں

سید صاحب لندن میں زیادہ دیر تک نہ ٹھہرے۔ وہاں سے فرانس کے دارالخلافہ پیرس میں چلے گئے مشرق میں انہوں نے بہت کام کیا تھا اب وہ اُن شہروں میں جاکر کام کرنا چاہتے تھے۔ جہاں مشرقی ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے ہوا کرتے تھے۔ ممکن ہے یہ بھی وجہ ہو کہ وہ سمجھنے لگے تھے یورپ میں جاکر وہ زیادہ سہولت اور آسانی کے ساتھ اپنا پروگرام جاری رکھ سکیں گے وہ تو دنیا میں صرف غلام ملکوں کو آزاد کرانے کے لئے آئے تھے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کی خدمت کو اپنا اصولِ حیات بنا لیا تھا۔ اور اسی اصول کیلئے وہ دنیا کے گوشے گوشے میں چکر لگا رہے تھے۔ کبھی افغانستان میں ہیں۔ تو کبھی ایران میں، کبھی مصر میں ہی تو کبھی ہندستان میں۔ ایک جگہ اُنکے قدم جمتے ہی نہ تھے۔ اگر وہ آرام و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتے تو ایک جگہ جم کر بیٹھ جاتے مگر کاہلی کی یہ زندگی انہیں قطعاً پسند نہیں

تھی۔!

فرانس کا مشہور فلسفی رینان فرانس کیا سارے یورپ میں بے مثال فلسفی مانا جاتا تھا۔ اُس نے اسلام کے متعلق ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں اسلام پر اعتراضات کیئے۔ سیّد صاحب نے اس مضمون کا جواب پیرس کے ایک مشہور پرچے میں شائع کرا کر سارے یورپ کو حیرت میں ڈالدیا رینان نے اس مضمون کی بہت تعریف کی۔

اس مضمون نے سیّد صاحب کی شخصیّت کو بہت نمایاں کردیا۔ وہ پہلے ہی بڑے عالم فاضل مانے جاتے تھے مگر اس مضمون نے تو ان کو چاردانگِ عالم میں مشہور کر دیا۔ یہ بات بتائی جاچکی ہے۔ کہ مصر میں سیّد صاحب کے مشہور شاگرد مفتی محمدؐ عبدہٗ سیّد صاحب کے پروگرام پر عمل کر رہے تھے۔ اُنھوں نے جب سنا کہ سیّد صاحب یعنی ان کے قابلِ عزت واحترام اُستاد۔۔ پیرس میں پہنچ گئے ہیں تو وہ بھی وہاں چلے گئے۔ سعد زاغلول پاشا بھی سیّد صاحب کی خدمت میں جا پہنچے۔ ان کے علاوہ سیّد صاحب کے ایک اور شاندار عزیز دوست مرزا باقر ایرانی بھی وہاں موجود ہوگئے تھے۔۔ گویا سیّد صاحب کے پاس ایسے لوگ موجود ہوگئے تھے۔ جو اپنا فرض پورا کرنے کے لیئے جانیں قربان کرنا معمولی بات سمجھتے ہیں۔

سعد زاغلول پاشا۔۔ ایک نیا نام نہیں ہے۔ آپ نے یہ نام ضرور سُنا

ہوگا. سید صاحب کی اسلامی تحریک نے جہاں بے شمار قوم پرور پیدا کیے تھے وہاں سعد زاغلول پاشا بھی اسی تحریک کا نتیجہ تھے۔ سعد زاغلول مصر کے مقبول ترین راہنما ثابت ہوئے اور ان کی مسلسل کوششوں سے مصر بہت جلد آزادی کے قریب پہنچ گیا۔

عروۃ الوثقیٰ

سیّد صاحب نے پیرس میں ایک انجمن قائم کی جس کا نام تھا "عروۃ الوثقیٰ" عروۃ الوثقیٰ کے معنی ہیں مضبوط رسّی۔ اسی انجمن کے ماتحت انہوں نے ایک ہفتہ دار پرچہ بھی نکالا۔ پرچے کا نام انجمن ہی کے نام کی رعایت سے رکھا گیا تھا۔ یعنی عروۃ الوثقیٰ۔ پہلا پرچہ ۱۳ر مارچ ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔ سیّد صاحب کے ساتھ مفتی محمد عبدہٗ بھی اس کے ایڈیٹر تھے۔

یہ پرچہ اس لئے شائع کیا گیا تھا کہ سیّد صاحب کے پیغام کو دور دور تک پہنچائے۔ اس پرچے کے مطالعے کے بعد اسلامی ملک سمجھیں کہ اُن کی بیماری کیا ہے۔ اور اس بیماری کا علاج کیا ہو سکتا ہے۔

افسوس چھ ماہ کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا!

عروۃ الوثقیٰ میں تین باتوں کی خاص طور پر تبلیغ ہوتی تھی

۱۔ اسلامی ملکوں کا آپس میں اتحاد، سیّد صاحب شروع ہی سے اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ اسلامی ملک آپس میں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن جائیں اور جب کوئی دشمن ایک اسلامی ملک پر حملہ کرے تو سب اسلامی ملک مل کر اس دشمن کا مقابلہ کریں۔ ظاہر ہے دشمن ایک ملک کو دبا کر طاقت کے زور اپنا ناجائز سے ناجائز مطالبہ منوا سکتا ہے۔ لیکن جب سب ملک اکھٹے ہو جائیں گے۔ اور ان کا آپس میں گہرا اتحاد بھی ہو تو دشمن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ حملہ کرنے کی جرأت ہی نہیں کرے گا۔ انیسویں صدی میں سیّد صاحب سے زیادہ کسی شخص نے اسلامی ملکوں کے اتحاد کی اتنی نمایاں کوشش نہیں کی۔ اگر سیّد صاحب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو آج کوئی اسلامی ملک بھی غلام نہ رہتا۔

اسلامی ممالک کے علاوہ سیّد صاحب مشرقی ملکوں کے بھی دل و جان سے ہمدرد تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یورپ کی خود پرست حکومتیں مشرق کو برابر دبائے جا رہی ہیں۔ انہوں نے ایشیا کے بازاروں میں لوٹ کھسوٹ مچا رکھی ہے۔ اس لئے وہ اسلامی ممالک کے ساتھ ساتھ مشرقی بالخصوص غلام ملکوں کے اندر بھی زندگی کی نئی لہر پیدا کر رہے تھے۔

۲۔ طاقت اور اقتدار کے حصول کی کوشش۔

طاقت اور اقتدار کے بغیر دنیا کا کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا۔ کمزور ملک کو چاہیئے کہ اپنے اندر طاقت پیدا کرے۔ اپنی فوج کی تنظیم کرے اور اس فوج میں بہادر اور اونچے اخلاق کے سپاہیوں کو بھرتی کیا کرے۔

طاقت صرف فوج کی کثرت ہی کا نام نہیں ہے۔ دولت بھی طاقت ہے۔ اعلیٰ دماغ بھی طاقت ہوتے ہیں۔ علم کی ترقی بھی طاقت ہے۔ ایک ملک کے طاقت ور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے طاقت ور ہے اس کی فوج مضبوط اور جنگجو ہے۔ بلند ہمت اور بلند ارادے ہے۔ اپنے جرنیل کے حکم پر جان دینا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اس ملک میں تعلیم عام ہے۔ لوگ اپنا نفع و نقصان بخوبی سمجھتے ہیں۔ اُن کے پیش نظر صرف اچھا کھانا پینا ہی زندگی نہیں۔ بلکہ اعلیٰ مقاصد کے حصول کا نام زندگی ہے۔ اس ملک میں زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی بڑی آسانی کے ساتھ پوری ہو جاتی ہیں۔ کوئی شخص بے کار بن کر سوسائٹی پر بوجھ نہیں ہے۔ کارخانوں میں زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی کھپت ہے۔

سید صاحب اپنے اخبار کے ذریعے ان باتوں کو پھیلا رہے تھے۔ جو شخص بھی اس اخبار کو پڑھتا تھا وہ سید صاحب کی رائے سے متفق

ہو کر اپنا فرض ادا کرنے لگتا تھا۔ اگر کسی ملک میں ہر شخص اپنے فرائض پہچان لے تو ملک کی ہر ترقی ممکن ہو جاتی ہے۔ چند آدمیوں کے فرض۔ شناس ہونے سے ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ سید صاحب عام طور پر نوجوانوں سے مخاطب ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ قوم کے یہ نونہال ہی سب کچھ کر سکتے ہیں۔

سید صاحب پیرس میں صرف اخبار نویس ہی بن کر نہیں گئے تھے وہ پرجوش اور باعمل آدمی تھے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ صرف اخبار کے دفتر میں بند ہو کر رہ جائیں؟

سید صاحب وہاں بیٹھے ہوئے تمام ملکوں کے حالات سے آگاہ تھے اور مختلف ملکوں میں پھیلے ہوئے دوستوں کو حالات کے مطابق مشورے دیتے رہتے تھے۔ کہ اب یہ کرو اور اب یہ کام کرنے کا موقعہ آ پہنچا ہے

پرنس ملکم خاں سے ملاقات

پیرس وہ سب سے زیادہ مصروفیت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ صرف پیرس ہی میں جم کر نہیں بیٹھ گئے تھے بلکہ یورپ میں گھومتے

رہتے تھے!

اس زمانے میں سیّد صاحب کی ملاقات ملکم خاں سے بھی ہو گئی۔ ملکم خاں لندن میں ایران کے سفیر تھے اور بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ دو چار ملاقاتوں میں سیّد صاحب اور ان کے درمیان کافی گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ سیّد صاحب اکثر ان کے یہاں جا کر گھنٹوں اسلامی ملکوں کی سیاسیات پر بحث کیا کرتے تھے۔ ملکم خاں انہیں ایران کے حالات بتایا کرتے تھے۔ اسطرح وہ ایران سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی ایران سے بے خبر نہیں تھے۔

ملکم خاں نے آئندہ زمانے میں سیّد صاحب کی بہت مدد کی۔

مہدی سوڈانی کی بغاوت

جس زمانے میں سیّد جمال الدین افغانی پیرس میں بیٹھے ہوئے اپنی سکیم پر عمل کر رہے تھے۔ سوڈان میں مہدی سوڈانی کی بغاوت کا بہت زور تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب مصر کے تخت پر توفیق بیٹھا تو اس نے قوم پرستوں کو دبانا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس نے سوڈان میں ایک ایسے شخص کو گورنر بنا کے بھیجا جو بڑا ظالم اور رعایا سے روپیہ وصول کرنے پر بڑی سے

سے بڑی سختی سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا. ظلم ایک حد تک اور ایک خاص وقت تک برداشت کیا جا سکتا ہے. اس کے بعد ظالم کیخلاف کوئی نہ کوئی تحریک شروع ہو جاتی ہے. یہ تحریک ظلم کا خاتمہ کرتی ہے. مہدی سوڈانی کی تحریک یا بغاوت ظلم کے خلاف ایک عملی احتجاج تھا. یعنی اس تحریک کا مطلب یہ تھا کہ سوڈان پر جو ظلم ہو رہا ہے. اس کا مقابلہ کیا جائے!

مہدی سوڈانی ایک معمولی آدمی تھے. ان کا نام شیخ احمد تھا. چونکہ باہمت، پرجوش اور اولوالعزم مسلمان تھے. اس لئے بہت جلد ترّقی کر کے سوڈان کے باغیوں کے راہنما بن گئے!

برطانیہ کی سلطنت کے لئے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر مہدی کی بغاوت زور پکڑ گئی تو سوڈان کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو مصر سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا اور انگریزوں کے لئے مصر چھوڑنا بہت نقصان دہ ثابت ہو گا.

جنوری ۱۸۸۴ء میں برطانیہ نے جنرل گارڈن کو مہدی کی بغاوت کو کچلنے کے لئے بھیجا. جنرل گارڈن نے سمجھا تھا کہ یہ بغاوت بہت معمولی ہے اور اسے کچل دینے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی. یہی اُمید لے کر جنرل گارڈن سوڈان کے دارالخلافہ خرطوم میں پہنچے. مگر حقیقت ان کی امید کے بالکل برعکس ثابت ہوئی. مہدی کی فوجوں نے خرطوم میں اُنہیں محصور کر لیا.

برطانوی حکومت کو حیرت بھی ہوئی اور پریشانی بھی۔ اس نے کمک بھیجی لیکن یہ کمک دیر سے پہنچی، مہدی کے سپاہیوں نے جنرل گارڈن کے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ برطانیہ نے نومبر میں دوبارہ کمک بھیجی مگر راستہ بند ہونے کی وجہ سے وہاں تک نہ پہنچ سکی۔ نتیجہ یہ ہوا ۲۶ جنوری ۱۸۸۵ء میں مہدی کی فوجوں نے خرطوم پر قبضہ کر لیا۔ اور جنرل گارڈن مارا گیا۔

برطانیہ نے کوشش کی کہ سید صاحب کے ذریعے مہدی سے صلح کر لی جائے۔ سید صاحب نے صلح کی سب سے پہلی شرط یہ رکھی کہ برطانیہ سوڈان سے اپنا قبضہ ہٹالیں۔ برطانیہ کے ذمہ یہ شرط ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔

برطانیہ نے یہ کوشش بھی کی کہ افغانستان، ترکی اور ایران کو روس کے خلاف مقابلے پر آمادہ کیا جائے۔ سید صاحب نے برطانیہ کو بتادیا کہ اگر حکومت برطانیہ مصر کو آزاد کر دے تو وہ اپنی کوششوں سے کام لیکر ان تینوں ملکوں کو روس کے خلاف متحد کر سکتے ہیں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ سید صاحب برطانیہ سے مایوس ہو کر روس گئے۔ کہ روس کو اسلامی ممالک کے ساتھ ملا لیا جائے۔ لیکن یہ ارادہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔ مگر روس جانے سے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اس زمانے میں روس کے مسلمانوں پر سخت ظلم ہو رہے تھے۔ ان کی مذہبی آزادی مفقود تھی۔ قرآن مجید اور مذہبی کتابوں

کی اشاعت ممنوع تھی۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے ظلم تھے جو اُن پر کئے جا رہے تھے۔ سیّد صاحب نے جب یہ حالت دیکھی تو اُنہوں نے روس کی حکومت سے بات چیت کی، مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے لئے متواتر ایک سال تک کوشش کی جب کہیں جا کر مقصد میں کامیاب ہوئے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو روس میں سیّد صاحب کی آمد روس کے مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑی رحمت ثابت ہوئی۔

ایران میں

روس سے نکل کر سیّد صاحب پیرس پہنچے اور پھر بوشہر چلے گئے وہاں ایک سال رہنے کے بعد ۱۸۸۶ء میں سیّد صاحب شیراز و اصفہان ہوتے ہوئے طہران پہنچ گئے۔ اس وقت ایران کے تخت کا وارث ناصرالدین شاہ "قاچار" تھا۔

ایرانیوں نے سیّد صاحب کا بڑی عزت سے استقبال کیا جب اُن کی ملاقات بادشاہ سے ہوئی تو بادشاہ نے خواہش ظاہر کی کہ وہ حکومت میں چند ایک اصلاحات تجویز کریں۔ سیّد صاحب ایران کے سب حالات جانتے تھے۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ایران میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اور

مستقبل میں اس کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے۔ یورپ میں بیٹھے ہوئے اُنہیں ہر واقعے کی صحیح صحیح اطلاع ملتی رہتی تھی۔ اب اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے بھی سارے حالات دیکھ لئے تھے۔ سیّد صاحب کو اصلاحات تجویز کرنے سے کیا انکار ہو سکتا تھا۔ اُنہوں نے بادشاہ کو ایسی اصلاحات بتائیں کہ جن سے حکومت مضبوط اور ہر دلعزیز ہو سکتی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ شاہ ان تجویزوں کے خلاف تھا۔ ان تجویزوں کے ماننے سے وہ من مانی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔

اب سیّد صاحب کا ایران میں رہنا زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتا تھا شاہ ایران نے اصلاحات کی خود درخواست کی تھی۔ اور جب اصلاحات ان کو دکھائی گئیں تو وہ ماننے پر تیار نہ ہُوا۔

پھر روس میں

ایران سے رُخصت ہو کر وہ روس میں پہنچے یہ دوسرا سفر تھا۔ سیّد صاحب روس سے پہلی مرتبہ گو کامیاب ہو کر نہیں آئے تھے۔ لیکن اُن کی ختم نہیں ہُوئی تھی۔ چنانچہ ۱۸۸۷ء میں وہ دوبارہ روس پہنچ گئے۔ روس میں ان کا ایک روسی اخبار نویس "کاتکوف" گہرا دوست تھا

یہ شخص سیّد صاحب کی دل وجان سے عزت کرتا تھا اور اُن کے بلند ارادوں سے واقف تھا۔ سید صاحب کی طرح وہ بھی چاہتا تھا کہ مشرق پر مغرب کا قبضہ ختم ہو جائے۔ اور ایشیا میں جتنے غلام ملک ہیں آزاد ہو جائیں۔

بدقسمتی سے سیّد صاحب کے روس پہنچنے کے چند دن بعد کاتکوف کا انتقال ہوگیا۔ سید صاحب کا ارادہ تھا کہ اُس کی مدد سے روس اور افغانستان میں صلح کرا دیں۔ مگر اب یہ ذریعہ باقی نہیں رہا تھا۔

سیّد صاحب پیٹرو گراڈ چلے گئے (پیٹرو گراڈ کو آج کل لینن گراڈ کہا جاتا ہے۔) وہاں ان کی زارِ روس سے ملاقات ہوئی۔ زارِ روس اُن کی ذات سے بہت متاثر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ زارِ روس نے سید صاحب کو روس کے مسلمانوں کا امیر بنانا چاہا۔ سیّد صاحب نے فرمایا کہ میں تو پہلے ہی مسلمانوں کا امیر ہوں۔

شاہِ ایران نے بھی سیر و سیاحت کی غرض سے ایران پہنچ گئے۔ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ شاہ ایران نے سید صاحب کو ایران آنے کی دعوت دی۔ سیّد صاحب پہلی مرتبہ اپنی اصلاحات کا حشر دیکھ چکے تھے۔ خاموش ہو گئے!

جرمنی اور پیرس میں

روس سے نکل کر سیّد صاحب جرمنی پہنچے۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ جرمنی گئے تھے۔ جرمنی میں چند روز سے زیادہ نہ ٹھہرے وہاں سے پیرس چلے گئے۔ شاہ ایران وہاں بھی پہنچ گئے تھے۔ اب دوسری مرتبہ ملاقات ہوئی۔ شاہ ایران نے اس مرتبہ ان کی خدمت میں خاص طور پر درخواست کی کہ وہ ایران آئیں۔ سیّد صاحب نے جواب دیا اگر حالات نے اجازت دی تو ایران آنے میں کوئی عذر نہ ہوگا!

سیّد صاحب کچھ عرصہ کے لئے روس چلے گئے۔ اور وہاں سے اُن کے قدم ایران کی طرف اُٹھنے لگے۔

ایران میں

ایران پہنچتے ہی سیّد صاحب کی تیز نظروں نے بھانپ لیا۔ کہ حالات بہت زیادہ بگڑ چکے ہیں۔ ایرانیوں کا چین اور امن تباہ ہو چکا ہے۔ آسودگی اور اطمینان غائب ہے۔ شاہ ناصرالدین اپنی ساری دولت

یورپ میں ضائع کر رہا تھا۔ رعیّت فاقوں سے نڈھال ہو رہی تھی ۔ شاہ دو تین مرتبہ یورپ کے مختلف شہروں میں جا کر ملک کا خزانہ ختم کر چکا تھا۔ اور اب مزید فضول خرچی کے لئے خزانے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ جب خزانہ خالی ہو، رعیّت پریشاں حال ہو، ملک کی فوج بکھر چکی ہو، اور تخت پہ ایک ایسا شخص بیٹھا ہو جو بزدل اور عیش پرست ہو تو ملک کے دشمن فائدہ اٹھانے میں کیوں تامّل کریں گے؟ یورپ مصر کی طرح ایران میں بھی لوٹ مار مچانے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

برطانیہ اور روس کو ایران میں خاص رعائتیں حاصل ہو گئی تھیں۔ گویا لوٹ مار کی ابتدا تھی، اہواز سے طہران تک سڑک بنانے کا ٹھیکہ ایک برطانوی کمپنی کو دیدیا گیا تھا۔ ملک کی معدنیات یورپ کے ساہوکاروں کو دی گئی تھیں انگریزوں نے ایران میں بنک قائم کرنے کی اجازت بھی لے لی تھی۔ ریلیں جاری کرنے کا ٹھیکہ روسی پرنس ڈولگرو کو دیا گیا تھا۔ تمام ملک کے تمباکو کا ٹھیکہ بھی غیروں کے سپرد کر دیا گیا تھا!

سیّد صاحب نے جانچ لیا تھا کہ اس ملک کی اب خیر نہیں ہے، آج نہیں تو کل ضرور تباہ ہو جائے گا۔ وہ چپ چاپ اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ شاہ ایران انہیں یاد کرے گا۔ وہ روس اور پیرس میں اُنہیں ایران آنے کی خاص دعوت دے چکا تھا۔ اسلئے اُس کا فرض تھا۔

کہ وہ اُنہیں جلد سے جلد بُلائے مگر شاہ ایران خاموش رہا۔

مجبور ہو کر سیّد صاحب نے بادشاہ کو خط لکھا جسمیں بتایا کہ وہ ایران میں آچکے ہیں۔ اس کے جواب میں شاہ ایران نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ صدرِ اعظم کے یہاں قیام فرمائیں سیّد صاحب نے کہا میں اپنے دوست حاجی محمد حسن کے یہاں قیام کروں گا۔

اس کے باوجود شاہِ ایران اور وزیرِ اعظم نے انہیں ملاقات کیلئے نہ بُلایا وہ کئی ماہ تک انتظار کرتے رہے۔

سیّد صاحب حاجی محمد حسن کے مکان پر اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ شاہ یا وزیرِ اعظم اُنہیں ضرور بُلائیں گے اور جو کچھ اُن کو کہنا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی سے کہدیں گے۔ ایران کے حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے اور سیّد صاحب ان بگڑے ہوئے حالات پر قابو پانے کے لئے آرزومند تھے۔ مگر یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوسکتا تھا کہ شاہِ ایران اس طرف توجہ کرے۔ سیّد صاحب نے ملک کی بہتری کے لئے جو اصلاحات تجویز کی تھیں وہ ابھی تک عملی صورت میں نہیں لائی گئی تھیں!

ایران کے حالات اور زیادہ بگڑ گئے۔ سیّد صاحب کی طبیعت سخت بے چین ہو گئی۔ ابھی ان حالات پر قابو پانا ممکن تھا۔ انہوں نے سوچا اگر ملک میں بدامنی پھیل گئی تو پھر ایرانیوں کے تباہ ہونے میں کوئی کسر

باقی نہیں رہے گی۔

وزیر اعظم در پردہ کوشش کر رہا تھا کہ سیّد صاحب کسی نہ کسی طرح ایران سے نکل جانے پر آمادہ ہو جائیں۔ سیّد صاحب حاجی محمد حسن کے مکان سے نکل کر طہران سے چند میل کے فاصلے پر شاہ عبدالعظیم کی درگاہ میں جا بیٹھے اور تقریریں کرنے لگے۔ لوگ جوق در جوق ان کے پاس پہنچتے تھے۔ اور بہت متاثر ہو کر واپس آتے تھے۔ سیّد صاحب کی باتوں میں عجیب جادو تھا۔ جو شخص بھی ایک بار ان کا وعظ سن لیتا تھا۔ ان کا مرید ہو جاتا تھا۔

والئے ایران نے سارے اختیارات اپنے وزیر اعظم کو سونپ دیئے تھے۔ وہی سیاہی و سفیدی کا مالک تھا۔ جو چاہتا تھا کرتا تھا اور جس کو چاہتا تھا عہدہ دے کر سرفراز کر دیتا تھا۔ سید صاحب نے وزیر اعظم کے خلاف تحریک شروع کر دی فوراً لوگ خفیہ انجمنیں بنا بنا کر وزیر اعظم کی مخالفت کرنے لگے۔ ان انجمنوں نے وزیر اعظم کے خلاف نفرت پھیلانے میں بڑا کام کیا۔

سیّد صاحب نے جب دیکھا کہ وزیر اعظم کے سننے پر شاہ ایران نے اُنہیں بالکل نظر بند کر دیا ہے۔ تو وہ ملاقات کی نئی راہ سوچنے لگے۔ اُنہوں نے شاہ ایران کو ایک طویل خط لکھا۔ جسمیں اُسے بتایا کہ میں نے

کوشش کی کہ ایران وروس کے درمیان جو نفرت پیدا ہو رہی ہے وہ مٹ جائے۔ چنانچہ ایران کے وزیرِ اعظم کی ہدایات کے مطابق میں روس میں گیا اور روس کی حکومت کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ نیک دلی کے ساتھ ایران کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے اور آپس میں جو شکر رنجی پیدا ہو گئی ہے اُسے کسی اچھے طریقے سے دور کر دے۔ میں یہی مقصد لے کر روس میں گیا تھا۔ اور روس کی حکومت کی طرف سے یہ پیغام لیکر آیا تھا کہ وہ ہر طرح صلح کے لئے تیار ہے۔ دونوں حکومتوں کے مدبّروں کا فرض ہے کہ وہ ایک جگہ اکٹھے ہو کر ان تمام شکوک کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ جو ان کے درمیان پیدا ہو گئے ہیں۔ میں کئی ماہ سے ایران میں موجود ہوں مگر نہ تو شاہِ ایران نے مجھے بلایا ہے اور نہ وزیرِ اعظم نے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ روس کی حکومت کو شک شبہ کرنے کا موقعہ مل جائے گا۔ اور میری ساری کوشش خاک میں مل جائے گی ۔! مجھے یقین ہے روس کی حکومت ایران سے بہت بدظن ہو گئی ہے ۔ بہر حال میں جواب کا منتظر ہوں ۔!

اس خط کا بھی جواب نہ ملا۔ سید صاحب سخت مضطرب ہو گئے۔ اُن کی آرزو کا خون ہو چکا تھا۔ روس میں اُن کے وقار کو کافی دھکا لگا تھا کیوں کہ وہاں وہ ایران کے نمائندے کی حیثیت سے گئے تھے۔ روس

کو یقین ہو گیا کہ جمال الدین نے اسے دھوکا دینے کے لئے اپنی نمائندگی کا ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ دراصل وہ ایران کا نمائندہ نہیں تھا!

دن پر دن گزرتے گئے۔ سیّد صاحب لوگوں کو ظلم کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک ملک کی سب سے بڑی طاقت اس کے عوام ہوتے ہیں۔ اگر عوام میں کوئی تحریک اُٹھے تو اسے دبایا نہیں جا سکتا!

سیّد صاحب لوگوں کو بتاتے رہے کہ دنیا میں ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ظلم کو مٹانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ اسوقت ایران ظلم کے پنجے میں گرفتار ہے۔ ایرانیوں کو اس ظلم کے پنجے سے نکلنا چاہیئے ورنہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے!

ایسی حالت میں وزیرِ اعظم خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ سیّد صاحب کو گرفتار کر کے ملک بدر کرنے کی تجویز سوچ رہا تھا۔ مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا سیّد صاحب کے ارد گرد ان کے ہزاروں عقیدتمند بیٹھے رہتے تھے۔ ایسے جاں نثار عقیدتمندوں کی موجودگی میں وہ سیّد صاحب کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

اتفاق سے سیّد صاحب بیمار ہو گئے ۔ ان میں چلنے پھرنے کی ہمت بھی نہ رہی۔ ایسی حالت میں حکومتِ ایران کے سپاہی موقعہ

پاکر سیّد صاحب کو گرفتار کر کے لے گئے۔ سیّد صاحب کو بصرہ میں پہنچا دیا گیا!

اس وقت تو کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ سیّد صاحب کو کسطرح گرفتار کیا گیا۔ اور کسطرح اُنہیں بصرے تک پہنچا دیا گیا۔ مگر جب سیّد صاحب نے اپنا مشہور خط حاجی مرزا حسن دین شیرازی کے نام لکھا کہ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ان پر کتنے ظلم کئے گئے۔ اور کس طرح اُنہیں تکلیفیں پہنچائی گئیں!

اس خط میں سیّد صاحب نے حاجی مرزا حسن دین کو ایران کے بگڑے ہوئے حالات سے مطلع کیا تھا۔ یہ خط کافی طویل ہے۔ ہم اس خط سے صرف وہی حصّہ نقل کرتے ہیں جسمیں سیّد صاحب کی گرفتاری کے حالات درج ہیں۔

جب سیّد صاحب کو گرفتار کیا گیا تو وہ سخت بیمار تھے۔ بیماری کی حالت میں اُٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار تھے۔ شاہ ایران کے سپاہیوں نے اُنہیں گدھے پر سوار کر کے اچھی طرح زنجیروں سے باندھ دیا۔ ایک تو بیماری کی تکلیف اور اسپر یہ ظلم۔ سیّد صاحب نے کتنی بڑی تکلیف اٹھائی ہوگی۔ اس وقت سردی کا موسم تھا۔ سخت سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہوا کے سرد جھونکے تیروں کی طرح سیّد صاحب کے بدن میں چبھتے تھے۔ اور

وہ زنجیریں ان کے جسم کو زخمی کر رہی تھیں! اسطرح ایک لمبا راستہ طے کیا گیا۔ جب سید صاحب ایران سے بصرہ پہنچا دیئے گئے۔ تو شاہ ایران نے ایک ایسا کام کیا جو ایران کا ایک دشمن ہی کر سکتا تھا۔ اس نے ایک یورپین کمپنی کو تمام ایران میں تمباکو کی کاشت کا ٹھیکہ دے دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایران میں جتنا تمباکو ہو گا وہ اس کمپنی کی ملکیت میں ہو گا۔ اور وہ ایران میں تمباکو بیچ کر کروڑوں روپے منافع حاصل کر لے گی۔

آپ نے پچھلے صفحات میں کہیں پرنس ملکم خاں کا نام پڑھا ہے۔ یہ صاحب لندن میں ایران کے سفیر تھے اور سید جمال الدین افغانی کے گہرے دوست تھے۔ اُنہوں نے شاہ ایران کی اس خود غرضی کے خلاف آواز اُٹھائی۔ شاہ ایران نے انہیں ملازمت سے برخواست کر دیا۔ ملازمت سے برخاست ہونے کے بعد پرنس ملکم خاں آزادی کے ساتھ شاہ ایران کی مخالفت کرنے لگے۔ اُنہوں نے لندن سے اپنا ایک اخبار نکالا جس کا نام 'قانون' تھا۔ اس پرچے میں وہ پورے جوش وخروش کے ساتھ ایرانی حکومت کے خلاف مضمون لکھنے لگے۔ ایران کی حکومت نے حکم دے دیا کہ اس اخبار کا کوئی نمبر ایران میں نہ پہنچایا جائے۔ مگر یہ حکم لوگوں کو ڈرا نہ سکا۔ قانون کے پرچے برابر ایران میں آتے تھے۔ اور خفیہ انجمنوں کے ذریعے

ایرانیوں میں تقسیم ہوتے تھے۔

سیّد صاحب کی شروع ہی سے کوشش تھی کہ علماء اسلام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیں۔ وہ جانتے تھے کہ اگر علماء اتفاق کر کے کوئی فتوے دیں گے تو دُنیا کے سب مسلمان اس فتوے کے مطابق کام کریں گے۔ اس مرتبہ بھی سیّد صاحب نے علماء کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ آپ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے مسلمانوں کے راہنما ہیں۔ آپ مسلمانوں کو ظالم کے پنجے سے رہا کر سکتے ہیں۔ ایران کا خود غرض اور عیّاش بادشاہ ایران کو بیچ رہا ہے۔ آج ایران کی حفاظت کرنا آپکا فرض ہے۔

سید صاحب کی آواز جنگل کی آگ کی طرح ہر جگہ پھیل گئی۔ علماء نے فتوے دیا اور یہ فتوے صرف ایک سطر کا تھا۔

"آج سے تمباکو کا استعمال خواہ کسی صورت میں ہو۔ اسلامی قانون کے خلاف ہے۔"

ایرانیوں نے آناً فاناً سارے کا سارا تمباکو ضائع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن صُبح سویرے شاہ ایران نے اپنے محل میں حُقّہ طلب کیا۔ نوکر نے عرض کی کہ محل میں تمباکو کا ایک پتہ بھی موجود نہیں ہے۔ علماء نے فتویٰ دیا ہے کہ آج سے تمباکو کا استعمال اسلامی قانون کے خلاف ہے۔

اس لئے تمباکو ضائع کر دیا گیا ہے۔

ایران میں ہر طرف حکومتِ ایران کے خلاف بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ شاہ ایران نے مجبور ہو کر تمباکو کا ٹھیکہ جو اس نے یورپین کمپنی کو دیا تھا منسوخ کر دیا۔

یہ کامیابی سیّد صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھی، مگر اب ایرانی اپنی حکومت سے بیزار ہو چکے تھے، بغاوت رُک نہیں سکتی تھی، اور پھر اس حالت میں کہ سیّد صاحب بغاوت کی اس آگ کو برابر بھڑکاتے چلے جا رہے تھے۔

لندن میں

سیّد صاحب بصرہ سے نکل کر لندن پہنچ گئے۔

سیّد صاحب نے زندگی کے میدان میں قدم رکھتے ہی طوفانوں میں گذرنا شروع کر دیا تھا۔ بڑے بڑے طوفانوں نے اُن کو ڈرانے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ آپ کبھی دریا کے ساحل پر گئے ہیں تو دیکھا ہو گا کہ دریا کی لہریں بڑے زور شور کے ساتھ گھاٹ کے پتھر کو اپنے ساتھ بہا لے جانا چاہتی ہیں۔ بار بار پتھر سے ٹکراتی ہیں۔

بار بار حملہ کرتی ہیں. مگر پتھر ہے کہ اپنی جگہ نہیں چھوڑتا۔ سیّد صاحب کی زندگی کا بھی یہی حال تھا۔ وہ جس ملک میں بھی گئے نئے طوفانوں میں گھر گئے۔ یہ ایسے طوفان تھے جن کا عام آدمی خیال بھی نہیں کر سکتا لیکن سیّد صاحب کی ہمت تھی کہ وہ ان طوفانوں کا مقابلہ کرتے رہے —
سب سے بڑا طوفان اُن کی زندگی میں اس وقت آیا تھا جب وہ ایران پہنچے تھے وزیرِ اعظم نے اُنہیں ڈرایا، دھمکایا، اور جب اس ڈرانے دھمکانے کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ تو انعام و اکرام کا لالچ دیا۔ مگر یہاں تو سیّد صاحب تھے. جنہیں دنیا کی کوئی چیز بھی اصُول چھوڑنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی!

لندن پہنچ کر اُنہوں نے "ضیاء الخافقین" کے نام سے عربی اور انگریزی میں ایک پرچہ نکالنا شروع کیا۔ اس پرچے میں سید صاحب خاص طور پر مضمون لکھا کرتے تھے. اس پرچے نے شائع ہوتے ہی ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ ایران کی حکومت نے اپنے سفیر کو (جو لندن میں مقیم تھا) ہدایت کی کہ کسی نہ کسی طرح سیّد صاحب کو اس پرچے کی اشاعت سے روکے. سفیر کی کوئی کوشش کارگر نہ ہُوئی۔

سیّد صاحب نے پرچے میں ایسے ایسے مضمون لکھے کہ شاہ ایران کانپ اُٹھا ایک مضمون کا تھوڑا سا حصّہ نقل کیا جاتا ہے۔

"جب سے یہ ظالم آدمی (ناصر الدین شاہ تاجدار) تخت ایران

پر بیٹھا ہے، اُس نے ایران کو برباد کرنا شروع کر دیا ہے، علماء اسلام کے ساتھ اسے کد ہے۔ وہ ان کی طاقت کو ہر طرح ختم کر رہا ہے۔ اگر علماء کی طاقت ختم ہو گئی تو مسلمانوں کی راہنمائی کے لئے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا!

یہ شخص عیاشی کی خاطر رعایا پہ طرح طرح کے ظلم کر رہا ہے۔ اور غریب رعایا سے جو کچھ حاصل کرتا ہے اُسے بُرے کاموں میں ضائع کر دیتا ہے۔

اسے وطن کی کوئی فکر نہیں ہے۔ چنانچہ یہ خود غرض دولت کے لئے اپنا وطن غیروں کے ہاتھ بیچ رہا ہے۔"

ہم نے خط کے ایک نہایت مختصر سے حصّے کو آسان زبان میں لکھدیا ہے، اس خط میں سیّد صاحب نے صاف طور پر لوگوں کو اس بات پر اکسایا ہے۔ کہ وہ بادشاہ کو تخت سے اتار دیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں اُنہوں نے لکھا ہے۔

"بادشاہ کو تخت سے اتارنا اتنا بھی مشکل نہیں جتنا کہ پاؤں سے جوتا اتارنا"

بجلی کی گرج کی طرح یہ آواز ہر طرف پھیل گئی۔ چنانچہ ۶ مئی ۱۸۹۶ء کو ایران کا یہ ظالم بادشاہ مار ڈالا گیا۔

واقعہ اسطرح بیان کیا جاتا ہے کہ ۱؍ مئی ۱۸۹۶ء کو شاہ ایران کی سالگرہ تھی۔ وہ اس تقریب میں شاہ عبدالعظیم کی درگاہ میں حاضر ہوا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ وہی درگاہ ہے جہاں سید صاحب سات ماہ تک مقیم رہے اور جب سخت بیمار ہو گئے تو شاہ ایران کے حکم سے گرفتار کر کے بصرہ پہنچائے گئے۔ راستے میں اُنھیں ناگفتہ بہ تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ اُن کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں باندھ کر گدھے پر سوار کر کے برف کے اوپر سے گزارا گیا۔ اور اُنھیں مار ڈالنے کی کوشش کی گئی —!

جب شاہ ایران درگاہ میں داخل ہو رہا تھا۔ تو یک بیک گولی چلنے کی آواز آئی۔ سب لوگ حیران ہو گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ایک منٹ کے اندر اندر بادشاہ خاک وخون میں تڑپ رہا تھا۔

بادشاہ کے قاتل کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ یہ شخص مرزا رضا خاں کرمانی تھا اور سید صاحب سے گہری عقیدت رکھتا تھا!

کہا جاتا ہے کہ سید صاحب کے اشارے پر یہ شخص بادشاہ کو قتل کرنے کا موقعہ ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط مگر یہ بات تو یقیناً صحیح ہے کہ اگر سید صاحب بادشاہ کے مظالم کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت نہ پھیلاتے تو کوئی شخص بھی اتنی جراءت سے کام نہ لیتا۔

۱۲ر اگست ۱۸۹۶ء کو مرزا رضا خاں کرمانی کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

سیّد صاحب کو ایران سے گہری محبّت تھی اور وہ ایرانیوں کی بہتری چاہتے تھے مگر افسوس ایران کی حکومت نے اُن کی قدر نہ کی اور وہ ایران سے نکل کر لندن چلے گئے۔ اگر حکومت ایران میں عقل کا مادہ ہوتا تو وہ سیّد صاحب کے وجود سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی۔ سیّد صاحب کے لندن جانے جانے کا بے شمار لوگوں کو افسوس ہُوا۔ ان میں سلطان ترکی بھی تھے۔ سلطان نے سیّد صاحب کو بار بار بُلایا۔ لیکن سیّد صاحب نہ آئے۔ آخر جب سیّد صاحب کے دوست پرنس ملکم خاں نے یہ بات معلوم کر لی۔ کہ سلطان کی نیت بالکل نیک ہے۔ اور وہ عزّت و احترام کے ساتھ سیّد صاحب کو اپنے ہاں بلا رہے ہیں۔ تو اُنہوں نے سیّد صاحب کو جانے کا مشورہ دیا۔ سیّد صاحب یہ مشورہ کیوں کر رد کر سکتے تھے۔ لندن چھوڑ کر ترکی جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ جب ترکی پہنچے تو سلطان بڑی عزت اور احترام کے ساتھ پیش آیا۔ نہ صرف یہ کہ ایک بڑا محل انہیں رہنے کو دیا بلکہ دو سو پونڈ ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ اس کے علاوہ دونوں وقت شاہی باورچی خانے سے کھانا بھی بھیجا جاتا تھا۔ شاہی گھوڑا بھی ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔

سلطان اُن کی اتنی عزت کرتا تھا کہ جتنی مرتبہ اُس نے سیّد

صاحب کو بلانیہ میں بلایا تو اُن کے چہرے پر بوسہ دیا۔ وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے سیّد صاحب نے سلطان کو یقین دلایا کہ وہ بہت جلد دنیا کی تمام اسلامی سلطنتوں کو متحد کردیں گے۔ ان سب کا ایک خلیفہ ہوگا جس کے ہر حکم کے سامنے سب سلطنتیں سر تسلیم خم کرتی رہیں گی!

حقیقت یہ ہے کہ سیّد صاحب کی سب سے بڑی خواہش ہی یہ تھی کہ دُنیا کے سارے اسلامی ممالک آپس میں متفق ہو جائیں! اس آرزو کو پورا کرنے کے لئے وہ دُنیا میں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ کبھی مصر میں جاتے تھے، کبھی ایران میں قیام کرتے تھے اور کبھی ترکی میں جا کر اپنا پیغام پہنچاتے تھے۔ سیّد صاحب نے شروع ہی میں بھانپ لیا تھا کہ یورپ کی لالچی حکومتیں اسلامی حکومتوں کو بُری طرح کچل رہی ہیں۔ اور اسوقت تک کچلتی رہیں گی جب تک ان میں مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا نہیں ہوگی۔ طاقت اتفاق میں ہے۔ چنانچہ ناصرالدین ناچار کو تخت سے اتارنے کا مقصد بھی یہ تھا۔ کہ یورپ آئندہ اسلامی سلطنتوں میں لوٹ مار نہ مچا سکے! اور اگر کوئی ظالم حکومت کسی اسلامی حکومت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے۔ تو سارے اسلامی ملک مل کر اپنے کمزور حلیف کی مدد کریں!

کتنا بلند مقصد تھا سیّد صاحب کا۔

سیّد صاحب نے مختلف اسلامی ملکوں کو خط لکھے۔ اور اُنہیں اسلامی اتحاد کی تلقین کی!

یہاں ایک خاص نقطہ غور کرنے کے قابل ہے۔ سیّد صاحب بھی اسلامی ملکوں کا اتحاد چاہتے تھے۔ اور سلطان عبدالحمید بھی، مگر دونوں کے خیالات میں بنیادی فرق تھا۔ سیّد صاحب یہ اتحاد چاہتے تھے کہ یورپ کی مختلف طاقتیں اسلامی ملکوں کو یکے بعد دیگرے ختم نہ کر دیں۔ لیکن سلطان عبدالحمید صرف اپنے تاج و تخت کو بچانا چاہتا تھا۔ سیّد صاحب کا ارادہ خلوص پر مبنی تھا۔ مگر اس کے برعکس سلطان اپنے ارادے میں خودغرض تھا۔

سیّد صاحب تمام اسلامی ممالک کا ایک خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ خلیفے کا مطلب ہے پیغمبر اسلام کا جانشین۔ جس پر ساری دنیا کے مسلمانوں کی دینی اور دنیوی راہنمائی کا فرض عاید ہوتا ہے۔ سیّد صاحب چونکہ ہر ملک کی حالت سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے اُن کا یہ ارادہ اسلامی ملکوں کے لئے بڑا نیک ارادہ تھا اس طرح وہ غیروں کے پنجے سے نکل سکتی تھیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ سیّد صاحب نے اسلامی ملکوں کو خط لکھے۔ ان خطوں کے جواب میں موصول ہو گئے۔ کوئی اسلامی سلطنت

بھی انکار نہیں کر سکتی تھی، مگر ایران کا بادشاہ اس تجویز کا حامی نہیں تھا کیونکہ اس تجویز کے ماننے سے وہ یورپ کی حکومتوں سے ساز باز نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے اپنے سفیر کو جو ترکی میں مقیم تھا، ہدایت کی کہ سیّد صاحب کو گرفتار کر کے ایران میں بھیج دیا جائے۔ ایرانی سفیر سید صاحب کو تو گرفتار نہ کرا سکا۔ مگر ان لوگوں کو گرفتار کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ جو سیّد صاحب کے ساتھ اسلامی اتحاد کے سلسلے میں کام کر رہے تھے۔

ان لوگوں کو گرفتار کر کے ایران بھیج دیا گیا۔

جب سیّد صاحب کو اس کا علم ہُوا۔ تو وہ فوراً عبدالحمید کے یہاں پہنچے اور کہا کہ ان کے ساتھ غدّاری کی گئی ہے۔ ان کے مددگاروں کو گرفتار کر کے ایران بھیج دیا گیا ہے۔ سُلطان کو اُس کا بہُت افسوس ہُوا انھوں نے حکم جاری کر دیا کہ ان لوگوں کو فوراً ترکی میں بھیج دیا جائے لیکن وہ لوگ تبریز میں قتل کر دیئے گئے۔

سیّد صاحب سلطان سے کبیدہ خاطر رہنے لگے!

ایرانی سفیر نے انتہائی کوشش کی کہ سیّد صاحب کو گرفتار کرایا جا سکے مگر ایسا نہ ہو سکا اس کی وجہ یہ تھی کہ ناصر الدین شاہ "ناچار کو قتل کرا دیا گیا تھا۔ سلطان عبدالحمید ڈرتا تھا کہ اس نے سیّد صاحب کا بال بیکا

بھی کیا تو اس کی خیر نہیں ہے!

سلطان اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے سیّد صاحب کو ہر طرح خوش کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اُن کے دربار میں بڑی قدر و منزلت تھی اور سلطان اُنہیں ہر تقریب پہ خاص طور سے بلایا کرتے تھے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ سلطان نے ان کی خدمت میں وہ شاہی تمغہ بھیجا جو وہ خوش ہو کر اپنے وزیروں کو عنایت کیا کرتا تھا۔ یہ تمغہ سلطان کی طرف سے بہُت بڑی قدر افزائی سمجھی جاتی تھی۔

شاہی قاصد جب یہ تمغہ لے کر سیّد صاحب کے ہاں پہنچا وہ طالب علموں کو سبق پڑھا رہے تھے۔ شاہی قاصد نے بڑے احترام کے ساتھ وہ شاہی تمغہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سیّد صاحب نے حقارت کے انداز سے تمغے کو دیکھا اور پاس بیٹھی ہوئی بلی کے گلے میں ڈال دیا۔ قاصد حیران رہ گیا۔ شاہی تمغہ اور اس کی یہ توہین۔ اس نے بڑے حیرت اور افسوس کے عالم میں کہا۔ "سید صاحب! آپ جانتے نہیں یہ شاہی تمغہ ہے۔"

سیّد صاحب نے فرمایا۔ "میں جانتا ہوں اور خوب جانتا ہوں

"تو پھر آپ نے کیا کیا؟" قاصد نے پوچھا۔

"بلی کے گلے میں ڈال دیا۔ کیونکہ اس کی بہتر جگہ ہے، جن لوگوں کے

گلے میں ایسے تمغے ڈالے جاتے ہیں۔ وہ عام طور پر بے ایمان ہوتے ہیں۔"

شاہی قاصد کے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا تھا۔ خاموش ہو گیا۔ اور اسی وقت سلطان کے پاس پہنچا۔ اور ڈرتے ڈرتے عرض کی۔

"حضور مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر کیا کروں کہنا ہی پڑتا ہے۔"

سلطان نے پوچھا "ہوا کیا؟"

قاصد بولا۔ حضور! سیّد صاحب نے آپ کے بھیجے ہوئے تمغے کی سخت توہین کی ہے۔ اسے بلّی کے گلے میں ڈال دیا ہے۔ اور کہا ہے جن لوگوں کے گلے میں ایسے تمغے ڈالے جاتے ہیں وہ عام طور پر بے ایمان ہوتے ہیں۔"

سلطان کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا اور ہونا بھی چاہیئے تھا۔ سیّد صاحب نے سلطان کی سخت توہین کی تھی۔ مگر وہ خاموش رہا اور قاصد کو چلے جانے کا حکم دے دیا!

اس کے باوجود کہ سیّد صاحب سلطان کے انعام و اکرام کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بلکہ شاہی اعزاز سے بالکل بے نیاز تھے۔ سلطان

ان کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اور برابر اُن کی عزت و تکریم میں اضافہ کرتا رہتا تھا۔ اگر سیّد صاحب کی بجائے کوئی اور ہوتا تو نہ معلوم اُس کا کیا حال ہوتا!

ترکی دربار میں لوگ سیّد صاحب کے خلاف ہو گئے تھے۔ اور اُنھیں زک پہنچانے کا موقعہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اُن کے آنے سے سلطان دوسرے وزیروں سے کچھ بے نیاز ہو گیا تھا۔ اور یہ کہ وزیروں کے لئے قابلِ برداشت نہیں تھا۔

سیّد صاحب سیاسیات کے کئی میدانوں سے گذر چکے تھے۔ ہوا کا رُخ پہچانتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک نہ ایک دن سلطان کے مصاحب میرے خلاف ضرور اقدام کریں گے۔ مگر وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جنہیں آنے والی مشکلیں ڈرا سکیں وہ اپنی جگہ جم کر کھڑے تھے اور جراُت و بے باکی کے ساتھ اپنے کام کئے جا رہے تھے!

اس زمانے میں مصر کا خدیو یعنی بادشاہ عباس حلیمی پاشا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ قسطنطنیہ آیا تھا۔ سیّد صاحب اس سے ملاقات کرنے کے آرزو مند نہیں تھے۔ ایک دن وہ کہیں ٹہل رہے تھے۔ کہ خدیو مصر وہاں آ پہنچا اور بڑی گرمجوشی سے مل کر بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا۔ سلطان کے درباریوں کے ساتھ بات آ گئی، اُنھوں نے درپردہ سلطان کو بتا دیا

کہ سیّد صاحب آپ کی بجائے خدیو مصر کو مسلمانوں کا خلیفہ بنانا چاہتے ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی ہے۔ سید صاحب ان کے خلیفہ ہونے کا اعلان کرنے ہی والے ہیں۔

سُلطان کانوں کا کچّا تھا، اس کے دل میں یہ یقین بیٹھ گیا۔ کہ سیّد صاحب ضرور اس قسم کی سازش کر رہے ہیں۔ وہ یقیناً خدیو مصر کو خلیفہ بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

سلطان کے حکم سے سید صاحب پر پولیس کی نگرانی رہنے لگی۔ چند دن کے بعد معاملہ صاف ہو گیا۔ سلطان کو معلوم ہو گیا کہ اسے سیّد صاحب کی طرف سے غلط فہمی ہُوئی تھی۔ اُنہوں نے خدیو مصر کے ساتھ خلافت کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ سلطان کو اس وقت افسوس ہُوا مگر سیّد صاحب اُس کی طرف سے بددل ہو گئے۔ اُنہوں نے جان لیا کہ سلطان اسلامی ممالک کے اتحاد کی کوشش کر رہا ہے وہ نیک نیتی پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ اسمیں اس کی اپنی غرض پوشیدہ ہے

اُسی زمانے میں ایک خاص واقعہ ہُوا۔ واقعہ یہ ہے۔

سیّد عبداللہ خادم مدینہ منورہ اور سلطان ترکی کے سب سے بڑے لڑکے کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ چونکہ ولی عہد کی اس میں کافی توہین ہُوئی تھی اس لیئے وہ سید عبداللہ کو کافی سزا دینا چاہتا تھا

جھگڑے کے بعد سیّد عبداللہ شاہ سیّد صاحب کے پاس آگیا، اور سیّد صاحب نے اُنہیں پناہ دے دی۔

سلطان کے حکم سے سیّد عبداللہ کی تلاش شروع ہوگئی۔ حکام کو جب معلوم ہوا کہ ان کا مجرم سیّد صاحب کے گھر میں ہے تو اُنہوں نے سپاہی وہاں بھیجے کہ اُسے گرفتار کر کے لے آئیں۔

جب سیّد صاحب سے کہا گیا کہ مجرم کو سپاہیوں کے حوالے کر دیا جائے تو اُنہوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اور جراءت کے ساتھ فرمایا میں اسے پناہ دے چکا ہوں اب دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے یہاں سے نہیں لے جا سکتی۔

سیّد صاحب نے سیّد عبداللہ کو خدیو مصر کے سپرد کر دیا جو اُسے اپنے ساتھ مصر لے گئے!

اس واقعے نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا!

سلطان اب بھی خاموش رہا۔ وہ دل میں ڈرتا تھا کہ اگر سیّد صاحب ترکی سے نکل گئے تو جس طرح اُنہوں نے ایران سے نکل ایران کے بادشاہ کو قتل کرا دیا تھا۔ میرے معاملے میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھیں گے۔

اس واقعے کے بعد ایک اور واقعہ ہوا۔ یہ واقعہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔

سلطان کی نظروں میں ایک شخص نے بڑی عزت حاصل کر لی تھی سلطان اسی کے مشورہ پر چلتا تھا۔ اور جو کچھ وہ کہتا تھا کرتا تھا۔ وہ سب سے بڑا درباری اور عالم سمجھا جاتا تھا۔ اس شخص کا نام تھا ابوالہدیٰ۔

سیّد صاحب کو اس شخص سے شدید نفرت تھی کیونکہ یہ خود غرض آدمی اپنے جاہ و جلال کے لئے سلطان کو بہت بڑے بڑے مشورے دیتا رہتا تھا۔ سلطان نے بڑی کوشش کی کہ سید صاحب اور ابوالہدیٰ کے درمیان صلح ہو جائے۔ لیکن سیّد صاحب اس بات کے لئے تیار نہیں تھے کیونکہ وہ اس شخص کو شیطان سمجھتے تھے۔

ایک دن سلطان نے سیّد صاحب کو کہلوا بھیجا کہ آپ ابوالہدیٰ سے صُلح کر لیں، کیونکہ آپ دونوں کی لڑائی میرے لئے بڑی تکلیف دہ چیز ہے۔ سیّد صاحب نے فرمایا۔ سلطان سے کہو کہ اگر جبریل آ کر میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے اور جب میں دروازہ کھولوں تو وہ اپنے پر میرے سر پر ہلا کر کہے آپ ابوالہدیٰ سے صُلح سے کر لیں جب بھی میں اس شیطان سے صُلح نہیں کروں گا!"

ان فقروں نے جہاں سُلطان کو اور زیادہ بدظن کرنے کا موقعہ دیا وہاں ابوالہدیٰ کے دل میں بھی یہ بات بٹھادی کہ سیّد صاحب کا وجود اُس کے لئے بڑا خطرناک ہے، وہ ایک نہ ایک دن اُسے ذلیل کر سکے

چھوڑیں گے۔ وہ بھی سیّد صاحب کو راہ سے ہٹانے کی تجویز سوچنے لگا اُسنے سیّد صاحب کے خلاف ایک کتاب لکھی اور اسے ہر طرف پھیلا دیا۔

اس کتاب میں سیّد صاحب کے اعتقادات پر حملہ کیا گیا تھا۔ اور اُن پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے تھے۔

سیّد صاحب کی نظر بندی

سیّد صاحب کی طرف اب ایک اور طوفان بڑھ رہا تھا۔ مگر ہمّت ہارنا تو اُنھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

سُلطان نے اُن پر پولیس اور جاسوسوں کی کڑی نگرانی لگا دی گویا وُہ نظر بند کر دیئے گئے تھے!

سیّد صاحب کا دوست بلنٹ جب اُنہیں ترکی میں ملا تو وہ سخت افسردہ تھے۔

جرأت دلیری اور بے باکی سیّد صاحب کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سخت نگرانی کی حالت میں بھی صداقت بیانی سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔ اُن کی ساری زندگی مصیبتوں اور تکلیفوں میں گذرتی تھی، موجودہ تکلیف اُن کے لئے کوئی نئی تکلیف نہیں تھی۔ اس لئے

کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ گھبرا کر اپنے اصول کو ترک کر دیتے۔

جاسوس سایے کی طرح اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ سلطان نے اُن پر سخت پابندیاں عاید کر دی تھیں، اُن کے دوست اور عقیدت مند اُن سے ملاقات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سلطان کو ڈر تھا کہ اگر لوگوں کو سیّد صاحب سے ملنے کی اجازت دے دی گئی تو وہ فوراً طوفان اُٹھا دیں گے۔ اور اس طوفان میں میرا تخت تنکے کی طرح بہ جائے گا۔

آپ نے چڑیا گھر میں لوہے کے پنجرے کے اندر شیر کو دیکھا ہوگا۔ باوجودیکہ وہ پنجرے میں بند ہوتا ہے۔ آپ کے اور اس کے درمیان لوہے کی بڑی بڑی مضبوط سلاخیں ہوتی ہیں۔ تاہم آپ اُس کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شیر ہے۔ سیّد صاحب کی شخصیت بھی ایک شیر کی سی تھی۔ نظر بند تھے تو کیا ہوا اس حالت میں بھی سلطان کے لئے بہت بڑا خطرہ تھے!

قسطنطنیہ میں سیّد صاحب کے شاگرد برہان الدین اکثر اُن کے پاس جاتے رہتے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں۔

"سلطان نے سیّد صاحب پر ہر قسم کی پابندی لگا دی تھی۔ جاسوس تھے کہ کسی حالت میں اُن کا پیچھا چھوڑتے ہی نہیں تھے۔ اُن کی ایک ایک حرکت کی خبر سلطان تک پہنچ جاتی تھی۔ صرف میں ایک ایسا شخص

تھا جو اِن پابندیوں کے باوجود اُن کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ اُن کی جسمانی حالت بہت کمزور ہو چکی تھی، پے در پے مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد اب اس عمر میں انہیں آرام کی ضرورت تھی، لیکن آرام کی بجائے اُنہیں جسمانی اور ذہنی تکلیفیں پہنچائی جا رہی تھیں!

اگر سیّد صاحب سلطان کے مصاحب خاص ابوالہدیٰ سے صلح کر لیتے اور جو کچھ سلطان چاہتا تھا وہ کرتے تو اُن کی زندگی بڑے آرام اور چین سے گزر سکتی تھی، آپ نے پڑھا ہوگا کہ جس وقت سیّد صاحب سلطان کے بار بار بلانے پر قسطنطنیہ آئے تھے تو سلطان نے فرطِ عقیدت سے اُن کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ شاندار محل اُنہیں رہنے کے لئے دیا تھا صرف یہی نہیں بلکہ دونوں وقت شاہی باورچی خانے سے اُن کے لئے کھانا جاتا تھا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا تھا کہ سلطان اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے سیّد صاحب کے وجود کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سیّد صاحب سب کچھ چھوڑ سکتے تھے، اپنا اصول نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اگر اپنا اصول چھوڑ سکتے تو دنیا کی کوئی راحت ایسی نہ تھی جو اُنہیں میسر نہیں آ سکتی تھی۔ عیش و آرام۔ اور عزّت۔ مگر سیّد صاحب اپنے لئے نہیں اپنے اصول کے لئے زندہ رہنا چاہتے تھے اور اپنے اصول کے لئے مرنا چاہتے تھے۔ اُن کی زندگی اور موت صرف اصول کے لئے تھی۔ اور وہ اصول تھا

"صداقت شعاری" سچی بات کے اظہار میں کسی سے نہ ڈرنا۔ مصیبتوں پر مصیبتیں اُٹھانا۔ پھر بھی اپنی جگہ کھڑے رہنا!

یہ ہے سیّد صاحب کی زندگی کا نمایاں ترین پہلو۔ بلکہ اُن کی ساری زندگی ہی اسی اصول کے گرد گھوم رہی تھی!

انتقال

سیّد صاحب کی زندگی ساٹھ سال کے قریب ہو چکی تھی۔ یہ ساری کی ساری سفر میں گزری تھی، کسی جگہ بھی چند ماہ یا چند سال سے زیادہ قیام نہیں کرتے تھے۔ بلکہ بعض شہروں میں تو صرف چند دن ہی قیام کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔ سفر کی تکلیفوں کے علاوہ اُنہیں بڑی بڑی تکلیفوں کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔ بیماری کی حالت میں برف کے اوپر سے گذرے تھے۔ بار بار نظر بند کیے گئے تھے۔ اور پھر صبح سے لے کر شام تک کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اُن کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی، قسطنطنیہ میں نظر بند تھے کہ اُن پر سرطان کا دورہ پڑا۔ سرطان بڑا خوفناک مرض ہے۔ اس مرض میں انسان بیہوش ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل پاشا ان کا علاج کرنے لگے، ڈاکٹر صاحب نے سیّد صاحب

کے چھ دانت نکال دیئے۔ مگر مرض کی شدّت میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

سیّد صاحب نے سلطان کو کہلوا بھیجا کہ وہ علاج کی غرض سے وائنا جانا چاہتے ہیں۔ مگر سلطان نے اجازت نہ دی، وہ ڈرتا تھا کہ گو سیّد صاحب بیمار ہیں، اور کام کرنے کے قابل نہیں۔ مگر شیر بیمار ہو کر بھی خطرناک ہوتا ہے۔ کیا خبر وہاں جا کر ایسا کام کریں کہ میری حکومت کا تختہ اُلٹ جائے

مرض بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر چند روز اور تکلیفیں برداشت کر کے سُلطان کے قید خانے سے ہمیشہ کے لئے رہا ہو گئے۔

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن!

آخری وقت میں سیّد صاحب کی یہ حالت تھی
گود میں ایک کتاب پڑی تھی اور ہاتھ میں تسبیح تھی!

سیّد صاحب کو قبرستان شیوخ (شیخ لوہرا راقی) محلہ ماچقا دفن کیا گیا۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ ان کا جنازہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اُٹھایا گیا اور بعض کتابوں میں درج ہے کہ بڑی خاموشی کیساتھ اُن کو سپردِ خاک کیا گیا!

اسی زمانے میں یہ خبر اُڑی تھی کہ سیّد صاحب کو زہر دیا گیا تھا۔ بلنٹ نے صاف صاف کہدیا ہے۔

"میں اس امر پہ یقین کرنے پر آمادہ ہوں کہ اُن کا مُہلک بیماری زہر

کا نتیجہ تھی، اُن کے دشمن بہت تھے اور اُن کا وجود سلطان عبد الحمید کے لئے عذاب جان بن گیا تھا۔

ابو سعید العربی نے اپنے اخبار جہان اسلام میں لکھا ہے

"سلطان سید صاحب کی آزاد خیالی کی وجہ سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ سید صاحب کو خلال کرنے کی عادت تھی، سلطان نے بہت سے خلال بھیجے جن میں زہر لگا تھا۔ سید صاحب ان خلالوں کے استعمال سے بیمار ہو گئے۔ نیچے کا جبڑا اتر گیا، اسی مرض میں فوت ہو گئے۔ لیکن مشہور یہ کیا گیا کہ موت سرطان کی بیماری کی وجہ سے ہوئی"۔

کچھ ہو بہر حال ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو وہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا جس کی شعاعوں نے ہر جگہ پھیل کر ظلم اور تشدد کے اندھیرے کو دور کر دیا تھا۔ اُن کی وفات نے سارے دُنیا کے مسلمانوں کو غمگین کر دیا۔

رات دن رویا کئے ۔ شام و سحر رویا کئے
رونے والے تیرے تجھکو عمر بھر رویا کئے

سیّد صاحب کی قبر عرصے تک بے نام و نشاں رہی، لیکن ۱۹۱۹ء میں ایک امریکن نے اُس کو اپنے خرچ سے پختہ کرا دیا۔

پہلی منزل سے آخری منزل

ہیں ـ اس کتاب کا لکھنے والا اور آپ ــ جو اس کتاب کو پڑھ رہے ہیں ــ ہم سب نے سیّد صاحب کے ساتھ منزل بہ منزل سفر کیا ہے۔ ہم اُنہیں مختلف حالتوں میں دیکھتے رہے ہیں۔ ہم نے سب سے پہلے اُنہیں اسوقت دیکھا جب وہ خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی کا پروگرام بنا رہے تھے، ہم اُن کے ساتھ اسوقت بھی رہے جب وہ اپنے اُصول کیخاطر پے در پے قربانیاں کر رہے تھے۔ ہم نے اُنہیں اُسوقت بھی دیکھا۔ جب اُن کو زنجیروں میں جکڑ کر برف کے اوپر سے گزارا جا رہا تھا اور سردی کی شدت سے اُن کا جسم یخ ہو گیا تھا ـ ہم اُسوقت بھی اُن کے ساتھ تھے جب سلطان عبدالحمید نے اُن کی صداقت شعاری سے ڈر کر اُنہیں نظر بند کر دیا تھا، اور پھر آخر میں ہم نے اُنہیں اُسوقت بھی دیکھا جب وہ تسبیح ہاتھ میں لئے آخری سانس لے رہے تھے۔ ہم زندگی کی ہر منزل میں اُن کے ساتھ رہے ہیں۔ جسمانی طور پر نہیں ـ کیونکہ یہ ممکن ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اپنے خیالات کی دُنیا میں ہم اُن کے ساتھ رہے ہیں! اُنھوں نے ہم کو زندگی کی بڑی گہری باتیں بتائی ہیں۔ کامیابی کے بڑے بڑے طریقے

تباٸے ہیں۔ انہوں نے ہم کو بتایا ہے کہ اصل کامیابی اس چیز کا نام نہیں ہے کہ انسان خوب کھاٸے پیٸے اور عیش کرے، یا اپنے گرد بہت سی دولت کے ڈھیر لگالے اصل کامیابی یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ انسانوں کے کام آٸے ظلم کا مقابلہ کرے اور اُسے مٹانے کے لیٸے تن من کی بازی لگادے۔ دُنیا میں کسی طاقت کے سامنے بھی نہ جُھکے۔ اپنے اصول کے لیٸے قربانیاں کرکے افسوس نہ کرے بلکہ خوش ہو کہ اُسنے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔

سیّد صاحب آج دنیا میں نہیں ہیں۔ مگر ان کا اصُول ہمیشہ زندہ رہے گا۔۔ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

سیّد صاحب کے اقوال

آخر میں ہم سیّد صاحب کے مضامین اور تقریروں میں سے کچھ حصّے درج کرتے ہیں۔

"اتفاق آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات قاٸم کرنے اور ایک دوسرے کے قریب تر ہونے کا نام ہے۔ اور یہ اُسوقت پیدا ہوتا ہے جب قوم کے ہر فرد کو قومی مفاد اور قومی نقصان

اتفاق

کا احساس ہونے لگے"

(اتحاد اور سیادت)

غلبہ "ملتِ اسلامیہ کی بنیاد غلبہ اور شوکت کو طلب کرنے، فتوحات حاصل کرنے، قوت و اقتدار بڑھانے اور قانونِ اسلام کے سوا باقی ہر قانون کا مقابلہ کرنے پر رکھی ہوئی ہے۔"

(نصرانیت اور اسلام)

اخوت "جس دن سے اسلام کا ابتدائی سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک مسلمانوں کی تاریخ کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ قبیلوں کے رشتوں اور رنگ و نسل کی بنیاد پر قائم ہونے والے تعلقات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ان کی نظریں صرف مذہبی اخوت پر جمی رہتی ہیں۔"

(اسلام اور وطنیت)

علامہ اقبال مرحوم نے اسی خیال کو اس شعر میں کہا ہے۔

اخوت غبارِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی، نہ افغانی، نہ تورانی

اخلاق "قانونِ الٰہی یہی ہے کہ جو قومیں اعلیٰ اخلاق سے مزین ہو کر زندگی کے میدان میں اترتی ہیں، وہ کامیاب ہوتی ہیں اور

جو قومیں اعلیٰ اخلاق پیدا نہیں کرتیں، مرجاتی ہیں،

(سوسائٹی کا خدائی دستور)

علامہ اقبال نے اس خیال کو بھی اس شعر میں ادا کیا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

"خودبینی اور خودپسندی سے انسان میں کبر و نخوت پیدا ہوتی ہے کبر و نخوت کی وجہ سے وہ انسانوں کو حقارت سے دیکھتا ہے اسلئے اس سے بُرے بُرے کام سرزد ہونے لگتے ہیں۔"

(عجب و کبر)

کبر

"یہ انسانی غفلت کا نتیجہ ہے کہ وہ یعنی انسان بہادری اور بیباکی کو فنا اور موت سمجھنے لگتا ہے وہ خیال کرتا ہے کہ بہادری میں اُس کی موت ہے۔ اگر وہ غور سے انسانوں کے حالات کا جائزہ لے تو اُسے معلوم ہو گا کہ یہ سارے خطرے صرف وہم ہیں"

(بزدلی)

بہادری

"حق کے راستے میں قدم اُٹھانا اور حق کے بول بالا کے لئے مال و جان قربان کرنا مومن بننے کی پہلی نشانی ہے۔"

(بزدلی)

تمانیدحق

علم

"عالم کی سلطانی علم ہی کے ہاتھ ہے۔ علم کے بغیر حکومت قائم ہو سکتی ہے، نہ کبھی ہوئی اور نہ آئندہ ہو سکے گی۔ جہالت کیلئے اسکے سوا اور کوئی چارہ نہیں دیکھا کہ بارگاہِ علم میں اپنی پیشانی رگڑے اور اپنی بندگی کا اعتراف کرے۔ یہی وجہ ہے کہ حکمرانی کبھی علم کے گھر سے نہ گئی۔ دُنیا کی ساری دولت و ثروت علم کا نتیجہ ہے دنیا میں دولت کا وجود علم کے بغیر مفقود ہی نہیں بلکہ علم کے بغیر کوئی دولت مند ہو ہی نہیں سکتا"

(علم اور طریقۂ تعلیم)

جہالت

"فقر و فاقہ، ذلّت و مسکینی، پریشاں حالی و گمنامی لوگوں میں اسوقت پیدا ہوئی، جب جہالت اور پریشانی اُن پہ چھا گئی"

(اخبار کے فوائد)

اخبارات

"وہ قوم جو بھلائی چاہتی ہے اور امن کی خواہاں ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ روزانہ اخبارات کے بغیر یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

(اخبار کے فوائد)

ملکی خدمت

اگر کوئی شخص اپنے حق میں نیکی کرنا چاہتا ہے تو یہ مشکل ہے

لیکن اگر وہ اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ تو اُس کو اپنی ذاتی خواہشات قربان کرنی ہوں گی۔

(روایت از مرزا لطف اللہ)

حق — حق وہ ہے جو دلیل و برہان رکھے۔

(مجلسِ وطن میں ایک مرتبہ لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا)

بہادری — شیر جہاں جاتا ہے اپنے لئے غذا مہیا کر لیتا ہے

(جب مصر سے نکالے گئے تو ایرانی سفیر نے تین ہزار پونڈ پیش کئے مگر اُنہوں نے حقارت کے ساتھ یہ رقم واپس دیتے ہوئے یہ مشہور فقرہ کہا)

تصنیف — "میں کتابیں نہیں لکھتا۔ میں زندہ کتابیں تصنیف کر رہا ہوں"

(اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ایسی کتابیں نہیں لکھتا۔ جو کاغذ کی ہوتی ہیں۔ میں زندہ کتابیں — یعنی حکومتوں کا تختہ الٹ دینے والے لوگ پیدا کرتا ہوں)

ظلم — جب کسی قوم میں ضعف اور غفلت کا غلبہ ہوتا ہے تو کوئی اجنبی قوم اس پر قبضہ کر لیتی ہے — طاقتور قوم کا ظلم کمزور قوم کے اندر نئی زندگی پیدا کر دیتا ہے، اور وہ محسوس کرنے

لگتی ہے کہ اس کی کھوئی ہوئی قوت پھر حاصل کی جاسکتی ہے

(عروۃ الوثقیٰ کے مضمون میں سے)

اگر اتفاق و اتحاد سے کام لیا جائے تو کوئی ایسی چیز نہیں جو حاصل نہ ہوسکے۔

(عروۃ الوثقیٰ کے ایک مضمون میں سے)

سیّد صاحب دوسروں کی نظر میں

دنیا میں بڑا آدمی وہ ہوتا ہے، جس کی ہر شخص تعریف کرے، جسکے کارناموں کو ہر شخص سراہے۔ ہر شخص کے چند دوست ضرور ہوتے ہیں، جو دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے دوست کو اچھا سمجھتے ہیں، اور ہر ممکن طریقے سے کام لے کر اُس کی تعریف کرتے ہیں۔ مگر حقیقی معنوں میں یہ تعریف تعریف نہیں ہے، تعریف وہ ہے جو دوست اور دشمن — دونوں کی زبان سے نکلے سیّد صاحب کو اس دُنیا سے گذرے ہُوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ مگر ان کی عزت و عظمت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے — اُن کا آوازۂ شہرت چار دانگِ عالم میں پھیل چکا ہے — اور

اپنے اور بیگانے ۔ سب ان کی عظمت کا دل و جان سے اعتراف کر رہے ہیں۔

یہاں ہم سیّد صاحب کے متعلق دوسروں کی دو چار رائیں لکھتے ہیں۔

'براؤن'

انگلستان کا بہت مشہور مُصنّف ہے، اس نے سید صاحب کے بارے میں کہا ہے۔

" سید صاحب خطرے کے مقابلے میں جری تھے، ہر خطرے کا مقابلہ بہادری کے ساتھ کرتے تھے۔ خوش خلق اور صاف گو تھے، ہر شخص کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اور جب بڑے لوگوں کے پاس جاتے تھے۔ تو آزاد طبع ہو کر جاتے تھے۔ سچی بات کہنے میں جھجکتے نہیں تھے۔"

'بلنٹ' لکھتے ہیں۔

جمال الدین ایک بڑے شخص تھے۔ اُن کی تعلیم میں ایک خاص اثر اور کشش پائی جاتی تھی، وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم اور فاضل تھے۔ وہ اپنے خیالات میں پکّے

تھے"۔

فرانس کے مشہور ادیب موسیو ہنری راشفو کہتے ہیں

"سید جمال الدین میں ایک پیغمبر کی سی خوبیاں پائی جاتی ہیں"۔

جرجی زیدان اپنی کتاب مشاہیر الشرق (مشرق کے بڑے آدمی) میں لکھتے ہیں!

"سیّد صاحب کی زندگی اور کارناموں کے مختصر حالات پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقصد جو ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہا اتحادِ اسلام تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو متحد کر کے واحد خلیفہ اسلام کے ماتحت لایا جائے۔ اس کوشش میں اُنہوں نے دُنیا کی سب خوشیوں کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ شادی بھی نہیں کی تھی۔ انہوں نے اپنے دوستوں اور مریدوں کے دلوں میں ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیا جو ہمیشہ اُن کو قربانیوں پر آمادہ کرتا رہے گا۔ مشرق نے ان کی قربانیوں سے فائدہ اٹھایا اور ہمیشہ اٹھاتا رہے گا۔

رنڈلف چرچل نے لکھا ہے۔

"جمال الدین بہت صاف گو اور نہایت صحیح رائے رکھنے والے آدمی ہیں۔"

ارنسٹ رینان لکھتے ہیں۔

"سیّد جمال الدین — ایک حیرت انگیز ہستی تھے، جو ایک طوفان کی طرح دنیا پر چھا گئے۔ اگر انہوں نے ایرانیوں کے دلوں میں آزادی کی سپرٹ پیدا نہ کی ہوتی - تو ایران کبھی آزادی کے لئے اتنی کوشش نہ کرتا اور اتنی جلد آزادی حاصل نہ کر سکتا۔"

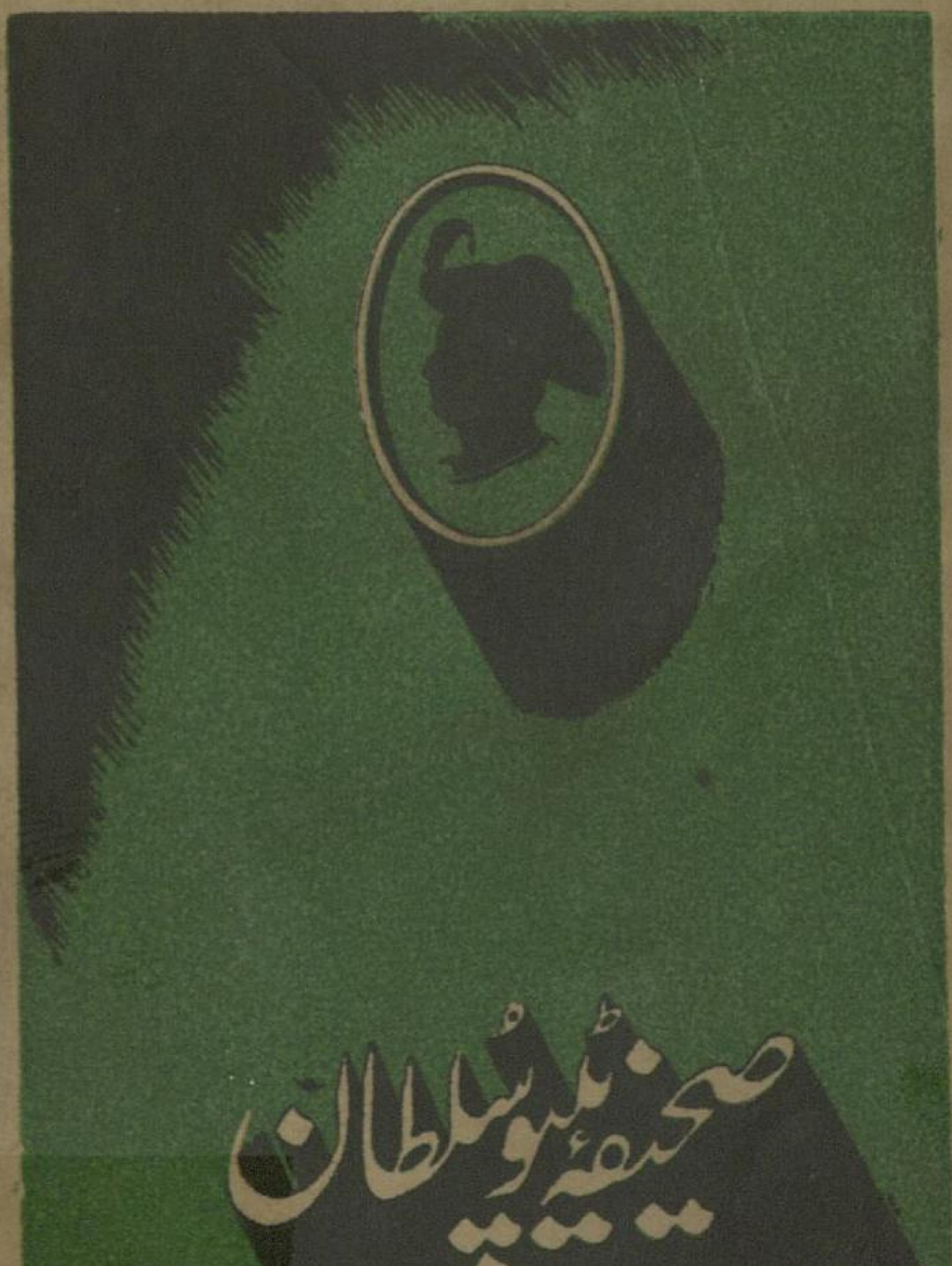
دگرگوں جہاں اُن کے زورِ عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے

'اقبال مرحوم'

دیگر کتابیں

آثار جمال الدین	عبد الغفار خاں	زیر طبع
مقالات جمال الدین افغانی	عربی سے ترجمہ	عہ/۱۲
مقالات جمال الدین افغانی	فارسی سے ترجمہ	عہ/۸
میرا وطن	جمال الدین افغانی	عہ/۴
ارشادات جمال الدین		عہ/۸
مضامین جمال الدین		عہ/۸
مقام جمال الدین افغانی		سے/
ردِ نیچریت	جمال الدین افغانی	عہ/

پبلشرز یونائیٹڈ، چوک انارکلی لاہور


صحیفۂ ٹیپو سلطان
محمود بنگلوری